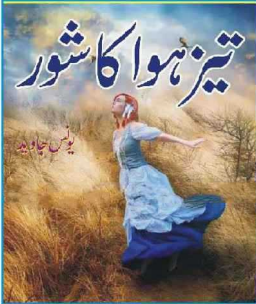


افسانے

تیز ہوا کا شور

یونس چاویز



تیز ہوا کا شور

(افسانے)

یونس جاوید

اس رات کا دورو

رات کی مانگ میں زردوروشنیوں کا سیندور دور تک بکھر گیا تھا۔ بھگی ہوئی اس رات کی ہوا مرطوب اور فضا بخ بستہ تھی اور بلاشبہ اس رات کے پہلو میں بڑا درد تھا۔

مگر دور تک سنان سڑک پر روشن کھنبوں کی قطاریں زندگی کا احساس دلاتی تھیں۔ وہ زندگی جسے ختم کیا جا رہا تھا وہ زندگی جس کی رگوں میں سرطان کے جراثیم دوڑا دینے کے منصوبے باندھے جارہے تھے اور ایسی بھی کتنی زندگیاں تھیں جو سرطان کے جراثیم کے بغیر سرطان زدہ کر دی گئی تھیں۔ ان زندگیوں کے جسم سرخ و سپید خطوط دلاویز اور چہرے کرب ناک تھے۔ ان جسموں میں دوڑنے والا لہو چند لمحوں میں منجمد کر دیا گیا تھا اور وہ روح جس نے صدیوں سے آج تک اجسام میں پرورش پا کر رشتوں کو جوڑا اور ناٹوں کو ترتیب دیا تھا۔۔۔۔۔ کسی کٹے ہوئے پروں والے پرندے کی طرح کلبلار ہی تھی۔

ایک روح-----بے شمار روہیں!

وہ صلیم ابھی تک دیوار کی اوٹ سے نہ نکلا تھا۔ صرف دو گز کے فاصلے سے کانٹوں والی تار کی باز شروع ہو جاتی تھی اور جس جگہ وہ کھڑا تھا اس جگہ اینٹوں کی پکی دیوار کا سایہ تھا جسے مزدور شام کو ادھورا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس کے آس پاس بڑے بڑے پتھر، سیمنٹ کی بڑی بڑی اینٹیں اور انہیں جوڑنے کا مسالہ بھاری مقدار میں بکھرا ہوا تھا۔ اور اینٹوں کے بے ترتیب چکوں کے درمیان وہ دیوار کے سائے میں نیا چسٹر کنڈھوں پر ڈالے دیر سے کھڑا تھا۔

بیٹھے بیٹھے وہ پہلی بار اس وقت کھڑا ہوا تھا جب باڑکی دوسری طرف کے سپاہی مطمئن ہو کر تار سے پچاس گز دور لگے ہوئے کیمپ میں جا کھڑے ہوئے تھے۔

[illegible]

ہیں“ جوی نے ایک پل رک کر جیب سے جام لگے بسکٹ نکالیا اور لھلھیم کے سامنے پھیلا کر بولا۔ ”میں اس کے لیے کھانا لایا ہوں جی کل صرف اس نے دو بسکٹ بڑی مشکل سے کھائے تھے۔ کل میرے پاس چائے نہیں تھی۔ یہ دیکھئے“ اس نے تھرموس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں آج اس کے لیے چائے بھی لایا ہوں۔ بسکٹ بھی میری جیب میں ہیں وہ بہت کمزور ہو چکا ہے جناب۔ رات میں اسے ضرور اپنے ساتھ گھر لے جاتا۔ مگر جناب اس کانٹے والی تار میں الجھ کر اس کا زخم چھل گیا تھا اور وہ رو پڑا تھا۔ اس لیے مجبوراً میں اسے چھوڑ گیا تھا۔ لیکن جانے وہ آج کیوں نہیں آیا۔ میں اس کا دیر سے انتظار کر رہا ہوں اور میری مٹی دیر سے میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ اور فکر مند بھی ہوں گی۔ اور میں خود بہت فکر مند ہوں جناب۔ کہیں وہ پھر کسی جیب کے نیچے نہ آ گیا ہو۔ یہ فوجی جیب بہت لا پرواہی سے چلاتے ہیں“ جوی کچھ کھسیانہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ ایک لمحہ وہ یونہی کھڑا رہا پھر اس نے آہستہ آہستہ نگاہیں اوپر اٹھا کر کہا۔ ”آپ فوجی تو نہیں ہیں جناب؟“

لھلھیم نے مسکراہٹ کو نمایاں کر کے جوی کا ذرہ در ذرہ دیا اور بولا ”تم یہ چائے واپس لے جاؤ اور کھانا مجھے دے جاؤ۔ میں دیر تک اسے تلاش کروں گا۔“

جوی نے تقریباً چپک کر کہا۔ ”آپ بڑے اچھے ہیں جناب۔ اور جوں بھی بڑا اچھا ساتھی ہے۔ اور آپ اسے دیکھ کر خوش ہوں گے۔ خدا کرے وہ ٹھیک ہو۔ دیکھئے اس کے گلے میں سیاہ رنگ کا پٹہ ہے۔ دم کئی ہوئی ہے اور گردن پر لمبے سفید بال ہیں۔ آپ اسے دیکھتے ہی پہچان جائیں گے۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگیں اسے پہچاننے میں آپ ک مدد دیں گی۔“ جوی ایک پل رک کر کچھ سوچتا رہا۔ اس ایک پل میں وہ بہت مضطرب دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ماتھے پر آٹے ہوئے بالوں کو دوٹی بار ایک طرف جھٹکا دے کر کہا۔ ”شاید وہ آپ کے ہاتھ سے بسکٹ نہ کھائے۔ مگر جناب آپ اسے تین بار بغیر رکے جوں جوں کہہ کر پکاریں گے تو وہ آنکھیں جھپک جھپک کر آپ کے قریب آ جائے گا۔ آپ بسکٹ کھلاتے ہوئے اس کے سر پر ضرور ہاتھ پھیریں گے۔ میں اکثر ایسا ہی کرتا ہوں۔ اور جناب“

جوی نے سرگوشی کے سے انداز میں لھلھیم سے کہا۔ ”اگر وہ آپ کو کسی ایسی جگہ ملے جہاں سے وہ تاروں میں سے اس طرف آ سکتا ہو۔ تو جناب آپ اسے اٹھالیں۔ پھر تو میں آپ کا بہت گہرا دوست بن جاؤں گا۔ میں اس کا علاج کروانا چاہتا ہوں نا۔ جوں میرے چھوٹے بھائی کا دوست ہے۔ چھوٹا بھائی رات کو اٹھ کر روتا ہے اور جوں کو یاد کرتا ہے۔ اور بہت ضد کرتا ہے۔ ہیں جناب۔“

جوی۔ بٹھا جوی جذبات میں آ کر لھلھیم کا چسپ جھنجھوڑنے لگا۔ شاید وہ ایک لمحے میں جوان ہو جانا چاہتا تھا یا ایک لمحے میں اپنے

جوز اپنے دوست سے۔ جب جوی کے بے شمار دوست اس سے بچھڑ گئے ہیں پھر یہ ایک ہونے کا نعرہ ڈھونگ ہی تو ہے۔ اب میں ماں کو کسی نہ کسی طرح یہاں لے بھی آتا ہوں تو میرے اس اندھے چچا کا کیا بنے گا جو سرحد کے بالکل ساتھ والی جین بلڈنگ کی تیسری منزل کے فلیٹ میں رہ رہا ہے۔ اس کے فلیٹ کی ساری کھڑکیاں مغربی برلن میں کھلتی ہیں۔ مگر وہ اندھا ہونے کے سبب مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ نہ ماں کو بلوا سکتا ہے نہ خود آ سکتا ہے۔ اس کے لیے تو مشرقی اور مغربی برلن کا سوال اسی دن پیدا ہوگا۔ جس دن ماں بھی ادھر آ جائے گی اور وہ مشرقی برلن سے ماسکو تک تنہا رہ جائے گا اس دن اسے اپنے فلیٹ کی دیواریں ڈسیں گی۔ جن سے وہ سترہ سال سے مانوس ہے۔ پھر ہم ایک کیسے ہیں؟ ڈاکٹر لیو بکے نے پانچ لاکھ مظاہرین کو ٹالنے کی خاطر یہ سب کچھ کہا ہے۔ اور پھر میز ولی برانڈ نے بھی صبر و تحمل کی تلقین کی تھی۔ ولی برانڈ اور لیو بکے اپنی اپنی ماں سے جدا ہیں کیا ان کے دوست بھی ان سے بچھڑ گئے ہیں؟ کیا وہ میری طرح اپنی کسی ماریا نہ کے لیے اپنا آبائی مکان چھوڑ سکتے ہیں؟ کیا یہ دیواریں کھڑی کرنے والے بھی انسانی دل رکھتے ہیں؟ کیا ان تاروں کی باڑھ کو پتھر پٹی دیوار میں بدل دینے سے جرمن قوم دو حصوں میں بٹ سکے گی؟ یہ سب سوالات میرے ذہن میں اس تقریر کے ساتھ ہی چپک آئے تھے۔ جو میں نے اپنے ایک دوست سے سنی ہے۔“

”یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ مگر اس وقت ان باتوں کو دہرانے کی بجائے تمہیں آرام کرنا چاہیے اور کل مشرقی برلن جانے کے لیے عملی طور پر کچھ کرنا چاہیے“ ماریا نہ دیر بعد بولی۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ وہ چپ ہو کر لیٹ گیا۔ اس وقت یوں بھی اس کا ذہن پریشان تھا۔

دوسرے دن وہ پھر سرحد کے ساتھ ساتھ دور تک چلا گیا۔ اسے وقفے وقفے سے فوجی بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک ملتے رہے۔ امن قائم رکھنے کے لیے دنیا کی دو بڑی طاقتیں جنگ کرنے پر تلی بیٹھی ہیں۔ چلتے چلتے اس کے ذہن میں ایک جملہ ابھرا، دنیا کے سکون کو لوٹ لینے کی آخری کوشش۔ ایک جنگ ہوگی تو دوسری جنگ خود بخود ختم ہو جائے گی۔ جو ختم ہوگی وہ سرد جنگ ہے۔ اور دوسری جنگ عظیم دنیا کی عظیم الشان جنگ ہے۔ پھر یہ قومیں رہیں گی نہ ملک یہ سرحد رہے گی نہ جوی کا زخمی جوز اور میری ماں اور اندھا چچا تو دھماکوں سے ہی مر جائیں گے اور جنگ ہوتی رہے گی۔ اور اس کے بعد ہر وہ شے ختم ہو جائے گی جس میں زندگی ہے زندگی کے آثار ہیں صرف ایک شے بچے گی۔ اور وہ ہوگا امن؟

مگر امن کا وجود تو جنگ کے بعد پیدا ہوگا۔ یا امن ہر ترقی یافتہ ملک اور ہر ترقی یافتہ قوم کی تباہی کے بعد پیدا ہو سکتا ہے۔ پس ماندہ قومیں اور ملک تو ہمیشہ ہی بچ جایا کرتے ہیں اور اب بھی بچ جائیں گے۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی ترقی کریں اور پھر امن کو وجود میں

جومی خاموش رہا۔

ولھیلیم پھر بولا۔ ”تمہارا جونیئر ڈاگ ہوسپتال میں زیر علاج ہے۔ تم فکر مت کرو۔ صحت یاب ہونے پر میں اسے تمہارے گھراؤں گا۔ اب تم بالکل اس کی تلاش کے لیے باہر نہ آیا کرو۔“

جومی کی پیشانی پر تیوریاں دیکھ کر ولھیلیم اس کے ذہن میں ابھرنے والے سوال کو سمجھ گیا۔ وہ فوراً کھانس کر بولا۔ ”جانے ڈاگ ہوسپتال میں بچوں کا داخلہ کیوں بند کر دیا گیا ہے۔ خیر میں اسے خود دیکھ آیا کروں گا۔“

جومی جاتے ہوئے خوش تھا۔ جاتے جاتے اس نے کہا۔ ”ہمارا مکان تو تھڑی ایچ ڈرگ روڈ پر ہے۔“

ولھیلیم نے الوداع کے طور پر ہاتھ ہلایا کہ جومی کو فوراً جانا پڑا۔ جومی چلا گیا تو ولھیلیم کچھ اور بھی اداس ہو گیا۔ جونیئر کے متعلق جھوٹ بولتے ہوئے اسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ اس پتھریلی اداسی کو رفع کرنے کے لیے یکبارگی وہ ہنس پڑا اور پھر کافی دیگر گہری رات کا انتظار کرنے کے بعد سنگی سناٹوں کا لبادہ اوڑھے وہ سرحد کی پتھریلی دیوار کے سائے میں سوچ کے روشن چراغوں کو تھامے کب سے جاگ رہا تھا۔ اتنا عرصہ سناٹے اور سری میں دفن رہے کے بعد اس کا جسم مفلوج سا ہو گیا تھا۔ پتھروں کے بکھرے ہوئے چکوں کے درمیان اکڑوں بیٹھے یوں بھی اس کے اعصاب اکڑ چکے تھے۔ اس کا دل اس وقت بے حد گداز ہو گیا تھا۔ رات کے پچھلے پہریوں بھی دل موم ہو جاتے ہیں۔ اس نے آنے والے دن کی قسم کھا کر دل کو یقین دلایا کہ وہ زندہ رہے گا۔

مگر رات کی ان گھڑیوں میں درد پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے گداز اور سہمے ہوئے دل پر ہاتھ رکھے پتھروں سے نکلا اور دیوار پر آچڑھا اور ایک منٹ تک دیوار پر کھڑا رہا۔ اور سمجھنے لگا کہ اس کے یہاں کھڑے رہے سے مشرق و مغرب کی تفاوت مٹ گئی ہے۔ برلن کے دونوں حصے مل گئے ہیں۔ ماں اور ماریانہ کے درمیان ایک کڑی بن گئی ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ امن چاہتا ہے، سکھ چاہتا ہے، ملاپ چاہتا ہے، زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اپنے لیے نہیں۔ دوسروں کے لیے اپنوں کے لیے، آئندہ نسل کے لیے، بنی نوع انسان کے لیے۔ عزت آبرو، آن ایمان۔ سب چیزیں زندگی کے بعد کی ہیں۔ مجھے زندگی دو، بڑھیا کو بیٹا دو، مایرانہ کو ولھیلیم دو، جومی کو اس کا دوست دو، یہی انسانیت کی معراج ہے۔ یہی آدمیت کا نشان ہے۔ یہی انسان کی اعلیٰ ترقی ہے۔ یہی فاتح کی پہچان ہے۔ اگر تم یہ کر سکو۔ تو میں ہر انسان یہ سمجھے گا کہ تم نے دلوں کو فتح کرنے والا ہم بنا لیا ہے۔

ولھیلیم دیوار پھانڈ گیا۔

دوسری صبح مشرقی اور مغربی برلن کے اخباروں میں دو الگ الگ خبریں چھپیں۔

مشرقی برلن کے اخبار میں لکھا تھا۔

”رات کے اندھیرے میں مغربی برلن کا ایک جاسوس گرفتار! ملزم کے قبضے سے اہم دستاویزات برآمد ہوئیں۔“

مغربی برلن کے اخباروں میں یہ خبر چھپی!“

”ایک بڑھیا نے اپنے اندھے دیور کے فلیٹ کی کھڑکی سے مغربی برلن میں چھلانگ لگا کر آمریت کے خلاف اور جمہوریت کے

حق میں اہم پارٹ ادا کیا ہے۔“

ماریانہ نے دونوں خبریں پڑھیں۔ اس کے لبوں سے دکھ بھری آنکلی۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے ننھے کیلنڈر کو اٹھایا۔ اور

لاشعوری طور پر اس کی انگلیاں ۳۱ اگست کی تاریخ کو مٹانے لگیں۔



نروان

ماں جی یوں تو کام میں جتنی نظر آتی تھیں مگر قدم قدم پر آؤ بھرتے ہوئے جیسے سب کچھ مجبوراً کر رہی ہوں۔ شاید ہی کوئی کام ہوگا جو انہوں نے مکمل اور مناسب طریقے پر سرانجام دیا ہو۔ لیکن کون سا کام ہوگا جس میں انہوں نے ذاتی طور پر دلچسپی نہ لی ہو۔ دیواروں کا جالا اتارنے سے لے کر زینت کی قمیص سینے تک انہوں نے جس سرگرمی کا مظاہرہ کیا تھا اس سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کام کرنے کی مہم بوری کا جو احساس دل میں لیے لیے پھر رہی تھیں اب اس میں انہیں راحت ملنے لگی ہے۔

زینت جب ممانی کے گھر سے لوٹی تو اس نے ماں جی کو شیشین چلائے دیکھا قریب آئی تو ماں جی نے سلی ہوئی قمیص اس کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ ”جلدی سے پہن کر مجھے دکھا۔“

قمیص پہن کر جب وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوئے تو بوکھلا سی گئی قمیص کا ایک پٹ الٹا تھا۔ چپ چاپ ماں جی کے سامنے آ گئی۔ ماں جی پہلی ہی نظر میں سارا معاملہ بھانپ گئیں۔ سوتی سے دھاگہ چھڑاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”اب میری عمر کام کرنے کی تو ہے نہیں، مجھ کوڑی کو تم لوگ قبر تک نہ چھوڑو گے؟ سانس لیتی ہوں تو کلیجہ جلتا ہے تمہیں کیا؟“

”پر میں نے آپ کو کب کہا تھا قمیص سینے کے لیے“ زینت نے یوں کہا جیسے وہ ماں جی کی بات کا اثر ہی ہو، مگر ماں جی بات پوری کر چکی تھیں۔ اس لیے اس نے بات کو آگے بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتی تھی کہ ماں جی کا اصل دکھ کیا ہے۔

پچھلی عید سے آٹھ روز قبل ان کا رشید کار کے حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا شاید رشید کو اتنے زخم نہ آئے ہوں گے۔ جس قدر بچو کے ماں جی نے اپنے دل پر محسوس کیے۔

وہ دنیا بھر کی کار کمپنیوں کو نکال ہونے کی بددعا دے دے کر بیسیوں بار بے ہوش ہو چکی تھیں دماغ ٹھکانے تھا نہ آنکھیں۔ برتن لے کر بیٹھتیں تو گھنٹوں مانجھتی چلی جاتیں۔ رشید کے کپڑے دھونے لگتیں تو ایک ہی کپڑے کو بار بار صابن لگاتیں اور دھوئے جاتیں پھر اسے استری کرتیں صندوق میں رکھتیں دوسری صبح نکال کر اس کے ٹوٹے ہوئے بٹن ٹانگتیں اور کھونٹی پر لٹکا کر جیسے فارغ ہو جاتیں پھر جب کھونٹی سے لٹکے لٹکے اس پر گرد کی تہہ سی جم جاتی تو پھر اسے دھونے بیٹھ جاتیں۔ رونا دھونا تو گویا ان کا معمول ہو گیا تھا۔

بیٹے کا دکھ کسے نہیں ہوتا۔ وکیل صاحب کو بھی تھا۔ مگر ماں بیٹے کا رشتہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ خاص طور پر اسے بیٹے کا جو جدا ہو چکا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ماں جی نے آنکھیں سمیٹ لیں۔ ”سلمیٰ بیٹی؟ میری بہو“ ان کے لب ہلے۔ وکیل صاحب دیر تک اس بات کے منتظر رہے کہ وہ کچھ اور بھی کہیں گی مگر وہ مزید کچھ بولے بغیر اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

وکیل صاحب کا خیال تھا کہ سلمیٰ کی منگنی اور زیت کی جوانی کا احساس ماں جی میں تغیر پیدا کرے گا مگر جس قسم کے تغیر کی انہیں توقع تھی۔ ماں جی نے اس کے بالکل الٹ مظاہر کیا۔ کام سے انہوں نے اسی روز سے کنارہ کر لیا۔ بات چیت بالکل بند، خلاؤں میں دیوانوں کی طرح گھورنا، کھانے کا خیال نہ ناشتے کی پروا۔

آندھی آنے سے پہلے عموماً ہوا بند ہو جاتی ہے کہ درختوں کے پتے یوں ساکت دکھائے دیتے ہیں جیسے پتھر سے راشتے گئے ہوں۔ ماں جی کا سنگین رویہ بھی اس بات کا غماز تھا کہ کوئی طوفان ان کے دل میں چھپا بیٹھا ہے۔ کوئی ایسا طوفان جسے انہوں نے اپنے بے ترتیب کاموں میں مصروف رہ کر نال رکھا تھا۔ کسی شدید خواہش کی شکست انسان کے لیے مفید بھی ہو سکتی ہے۔ مگر اس شکست کا احساس اس کی ناکامی کا عملی اعتراف ہے۔ بلاشبہ یہ اعتراف اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ ماں جی کو سلمیٰ کی منگنی کی خبر سنا کر وکیل صاحب نے اس شکست کا احساس دلایا تھا جسے وہ خود بھی زندگی کی سب سے بڑی شکست سمجھتی تھیں اور جس احساس کو دبانے کی خاطر انہوں نے ذہنی توازن تک کھود یا تھا۔

باورچی خانے سے ملحق کمرے میں چار پائی پر اوندھے منہ لیٹ کر انہوں نے اپنے ماضی کو بھلانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ واقعات ایک ایک کر کے علیحدہ علیحدہ بالکل صاف متحرک تصویروں کی طرح ان کے سامنے ناچتے اور وہ کرب سے کراہ اٹھیں۔ رات کو جب زینت انہیں کھانا دے کر کمرے میں گئی تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ کھانے کی ٹرے زمین پر رکھ کر اس نے دروازے کی دراڑوں سے کان لگا دیئے۔ وہ کافی دیر تک اسی حالت میں کھڑی رہی۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو ماں جی رو رہی تھیں۔

انسانی دکھ زائل کرنے میں جو کام آنسو کرتے ہیں شاید سب سے قریبی دوست بھی نہیں کر سکتے۔ مای جی نے زینت کو دیکھ کر آنسو پونچھے اور مسکرانے کی کوشش کی پھر زینت کو گھور کر دیکھا اور لمبی آہ بھر کر بولیں۔ ”سلمیٰ بے چاری کی شادی ہو رہی ہے۔“ یہ دکھ بھی عجیب تھا۔ اسی دکھ کے سہارے تین چار دنوں میں ان کی حالت بہتر ہو گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ شکست کو دیکھ چکی ہیں مگر تسلیم نہیں کرنا چاہتیں۔ اس ایک خیال نے ان میں بلا کی چستی اور قوت ارادی پیدا کر دی اور یہی قوت ارادی انہیں کرن بشیر کے گھر تک لے گئی۔

وہاں جا کر بھی انہوں نے خلاؤں میں گھورانہ بے مقصد باتیں کیں، بڑی متانت اور سلیقے سے جا کر بیٹھیں۔ سب نے مزاج پوچھا، ہر ایک کو انہوں نے ہنس کر مناسب جواب دیا۔

بیگم بشیر نے پر تکلف چائے کا اہتمام کیا تھا۔

چائے کے دوران اس نے مٹھائی کی پلیٹ ماں جی کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔ ”جیل کے سسرال کی طرف سے جو مٹھائی آئی تھی نا“ ہاں ہاں۔ ماں جی نے بات کاٹ کر انجان بننے کی کوشش کی۔ ”کہاں مٹھرائی نسبت؟“ وہ موضوع سے ہٹ گئیں۔

”شمس الدین خاں کی لڑکی سے۔ بھلا آپ سے زیادہ کون جانتا ہوگا انہیں۔“

”ہاں“ ہاں کو انہوں نے اس قدر لمبا کیا کہ مٹھائی کا ایک ریزہ ان کے منہ سے اڑ کر پلیٹ میں آگرا۔ لقمہ نگل کر انہوں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے اسے۔“

بیگم بشیر لہجے کے طنز کو محسوس نہ کر سکیں۔ ”مٹگنی پرسوں ہوئی ہے۔ وہ بولی۔ آج مٹھائی کی تقسیم ہوگی محلے میں!“

”اوں ہوں“ ماں جی نے اب کے ذرا تیز آواز نکالی۔

لقمہ بیگم بشیر کے حلق میں اٹک سا گیا وہ جلدی سے کھنکھار کر بولیں ”کیا خیال ہے تمہارا“

یہی وہ موڑ ہے جہاں شکست، شکست نہیں رہتی۔ ماں جی کو کھل کر کہنے کے اس موقع کا انتظار کب سے ہوگا۔ پھر بھی وہ بڑے محتاط طریقے سے بولیں۔ ”لڑکی خوبصورت ہے۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے رشید کے لیے میں نے جس کاوش سے یہ رشتہ حاصل کیا تھا۔ کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ لاکھوں میں ایک گھرانہ ہے۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں مگر۔“ ماں جی نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی!

”مگر کیا؟“ بیگم بشیر اس بھاری بھر کم خبر کو یوں کھلے محن میں کیوں کر سنیں۔ ماں جی کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئیں۔ کمرے کا دروازہ بھیڑتے ہوئے ن کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ صوفے پر قریب بیٹھ کر انہوں نے ماں جی سے بڑے ہی دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ تو پورے خاندان کو اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں تو پہلے ہی آپ کی طرف آنے والی تھی۔ مٹگنی آخر کی کس لیے جاتی ہے ایک دوسرے کو دیکھنے پر کھنکھنے کے لیے“

”ہاں ہاں“ ماں جی تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر بولیں۔ ”کیوں نہیں مگر غیبت کرنا میرے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ اللہ میرے بچے کو بخشے، مرتے مرتے باپ کے کان میں یہ بات کہہ گیا تھا۔ غم سے نڈھال میں تو لاش بھی نہ دیکھ سکی۔ ورنہ جانے اس بے چارے

کے دل میں کیا کیا تھا۔ اولاد کی رازدار تو ماں ہوتی ہے نا۔ باپ سے بے چارہ کیا کچھ کہتا۔ البتہ اس بات کی تاکید اس نے مرتے مرتے بھی کر دی تھی کہ یہ بات کھلے نہیں۔“ ماں جی نے سسکی بھر کر آنچل کو آنکھوں پر رکھ لیا۔ ”اے ہے یہ کہاں کی غیبت ہوئی بھلا“ بیگم بشیر نے بڑے تحمل سے ساری بات سن کر کہا۔ ”اور پھر میں بچی تھوڑی ہوں جو گھر گھر کہتی پھروں گی۔“

ماں جی نے آہستہ آہستہ چہرہ صاف کیا۔ ”ہائے اللہ میں سب کچھ کیسے کہہ دوں“ انہوں نے آہ بھری۔ ”بہو تو میری ہی تھی نا۔“

”مگر بات کیا تھی آخر“ بیگم بشیر تجسس کی آگ میں جل رہی تھیں۔ ماں جی نے کچھ دیر توقف کیا تو بیگم بشیر کروٹ بدل بدل کر انگاروں پر لوٹتی رہی۔

”بس اب کہہ بھی چکو وکیلن۔“ وہ پھٹ کر بولیں۔

”لڑکی بد کردار ہے۔ گلی گلی بدنام۔ بیگم بشیر پہلے تجسس کی آگس میں جل رہی تھی تجسس ختم ہوا مگر آج وہیں کی وہیں تھی۔“

”آگ اپنی خاصیت بدل سکتی ہے بھلا“ ماں جی پھر بولیں۔ ”برائی آخر برائی ہے، لاکھ پردوں میں چھپاؤ نہ چھپے گی پہلے یہ خبر سینہ بہ سینہ پھیلی، پھر اڑنے لگی۔ میری کوشش یہی رہی ہے کہ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہو۔ لڑکی خراب ہے تو اس میں ماں باپ کا کیا قصور بے چارے خواہ مخواہ بدنام ہوں گے۔ تم بھی اسے اپنے تک رکھنا۔“ ماں جی کچھ دیر خاموش بیٹھی اس بات کی منتظر رہیں کہ بیگم بشیر شکر یہ ادا کرے گی۔ مگر وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھی رہی۔

”قسم ہے تمہیں جو بات آگے بڑھاؤ تو“ ماں جی نے اٹھتے اٹھتے کہا ”لوگ نام رکھیں گے تو مجھے غیرت آئے گی۔“ ماں جی برقع اوڑھ کر یوں کمرے سے نکلیں۔ جیسے بیٹے کی واپسی کی خبر پا کر نکل رہی ہوں۔

دوسری شام وکیل صاحب نے خود بڑی حیرت سے انہیں یہ خبر سنائی کہ کرنل بشیر کے لڑکے جمیل کی منگنی سلمیٰ شمیم سے ہو کر ٹوٹ گئی ہے۔ ماں جی بظاہر بڑی حیران ہوئیں۔ مگر گھٹنے بھر میں ان کے چہرے پر نکھار اور شگفتگی سی آ گئی کہ وکیل صاحب مسکرائے بھی اور حیران بھی ہوئے۔ اسی شام انہوں نے اچھے کپڑے پہنے، سرمہ اور خوشبو لگائی اور نماز بھی پڑھی۔ زینت ماں جی کی طبیعت معمول پر آ جانے کی وجہ سے بے حد خوش تھی۔ اسی خوشی میں اس نے گھر کے سارے کام خود سنبھال لیے تھے۔

ماں جی دن بھر موتے کی بیلوں کے پاس بیٹھی رہتیں۔ شام کو اپنے کمرے میں آ کر نماز پڑھتیں۔ وہیں زینت انہیں شام کا کھانا دے جاتی۔ کھانے کے دوران ماں جی زیادہ تر گھریلو قسم کی باتیں کرتیں، کچھ ہدایات دیتیں اور پھر اسی کمرے میں سورتیں۔

ایک روز جب زینت ان کے لیے چائے لے کر برآمدے میں آئی تو ماں جی خلاف معمول بڑے کمرے میں ٹرنک کھولے بیٹھی

تھیں۔ زینت جب وہاں پہنچی تو ماں نے چائے لے کر زمین پر ہی رکھ دی اور زینت کو چار پائی پر بٹھالیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا منہ چوما اور ٹرنک کا ڈھکنا بند کرتے ہوئے کہنے لگیں۔ ”تو میری زیادہ ہی خدمت کرنے لگی ہے سو جتنی ہوں جب تو اپنے گھر چلی جائے گی کون میرے پیچھے پیچھے یوں چائے لے کر پھرے گا۔“

زینت یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے سامنے اس کی ماں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے، شرماسی گئی۔ سر پر آٹھل درست کرتے ہوئے اس نے ماں جی سے قطعاً آنکھ نہ ملائی۔ صرف آہ بھر کر رہ گئی۔ اس آہ میں غم، خوشی، جدائی اور وصال ساری کیفیات یکجا ہو گئی تھیں۔

”رشید زندہ رہتا تو سلمیٰ اس گھر کی بہو بن کر آتی۔“ ماں جی پھر بولیں۔ ”پھر مجھے کس بات کی فکر تھی۔ تمہارے بعد بہو اور بیٹی دونوں کی کمی اسی ایک کی ذات سے پوری ہو جاتی۔ مگر تقدیر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے“ ماں جی اٹھ کر چار پائی پر آ بیٹھیں۔

”رشید کے بعد تو مجھے اس سے کچھ زیادہ ہی لگاؤں ہو گیا ہے۔ بعض جی چاہتا ہے کہ کسی بہانے اڑ کر جاؤں اور سلمیٰ کو گلے لگا لوں۔ احمد جوان ہوتا تو کبھی یہ رشتہ ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ اس رشتہ کے لیے جج صاحب کے گھر جا جا کر تین جوتے توڑے ہوں گے میں نے۔ اب ہر کوئی اس پر نگاہ رکھے بیٹھا ہے ذات کا پتہ خاندان کی خبر۔ اور وہ لوگ ہیں کہ لڑکی کو بوجھ سمجھ کر کندھوں سے اتارنا چاہتے ہیں“ ماں جی کچھ دیر دک کر پھر دیوانوں کی طرح چھت کو گھورنے لگیں۔ ”ہائے“ انہوں نے لمبی سی آہ بھری ”اسے کوئی اور بیاہ کر گیا تو میں کیا کروں گی۔“

زینت نے ماں جی کی بات پر توجہ تو دی مگر جواب نہیں۔ ”اونچا لمبا قد ہے اس کا۔“ وہ دھیرے دھیرے بولیں۔ ”تجھ سے بالشت بھر اونچی ہوگی۔ جب میں پہلی بار اسے دیکھنے گئی تھی تو کلیجہ تھام کر رہ گئی تھی۔ ہم پر بھی جوانی آئی تھی۔ مگر یہ تو کچھ اور ہی شے تھی۔ دودھ اور سیدور کا بنا ہوا جسم جانے کس سانچے میں ڈھالا گیا تھا کہ بال بال اپنی جگہ مناسب دکھائی دیتا تھا۔ نظر بھر کر دیکھنے سے جلد میلی ہوتی تھی۔ کانسی کے تھال سا چہرہ اور طاق میں رکھے ہوئے دو چراغوں کی طرح بھیگی بھیگی اور روشن آنکھیں۔ چلتی تو جسم پلک پلک جاتا۔ رکتی تو جیسے گٹھا چاگئی ہو۔

لجاتے ہوئے اس نے مجھ سے صرف ایک بار آنکھیں ملائیں اور پھر جھکا لیں۔ ہائے عورت ہوتے ہوئے میں لرز گئی تھی۔ جب اس نے نظریں جھکائیں تو مجھے یوں لگا جیسے دیوار پر سے دھوپ اتر رہی ہو۔ سن رہی ہوں تو میری بات“ ماں جی سسک پڑیں۔ ”جانے کون موالے جائے گا اسے بیاہ کر“

ہوئی بولیں۔ ”یہ پروفیسر الطاف وہی ہیں ناجو جج صاحب کے پڑوس میں نئے نئے آئے ہیں۔“

”ہاں“ وکیل صاحب نے کہا۔ ”ویسے جان پہچان پرانی ہے۔“ انہوں نے چائے کا آخری گھونٹ بھر کر سگریٹ سلگایا اور بات آگے بڑھائی ”میرا تو خیال ہے کہ جج صاحب نے اصرار کر کے انہیں اپنے پڑوس میں بلوایا ہے۔ ایک روز باتوں باتوں میں ذکر کر رہے تھے۔ رشید انہیں بھی ابھی تک نہیں بھولا کہتے تھے۔“ جب تک سلمیٰ کنواری بیٹھی ہے۔ رشید کی یاد شدت سے آتی رہے گی اور پر کیا معلوم بیٹی بیانی جانے کے بعد بھی دکھی رہے۔ بیٹیوں کے اوپر سکھ کے دن توڑتے بادل کا سایہ ہوتے ہیں“ وکیل صاحب کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بولے ”جوانی کی موت بھی عجیب شے ہے“ ان کی نگاہیں سامنے لگی ہوئے رشید کی تصویر پر تھیں۔

ماں جی کے چہرے پر اچھایا برا کوئی تاثر نہ ملتا تھا۔ بس اتنا فرق پڑا کہ دونوں بالکل خاموش اوگھنے کے انداز میں بیٹھے رہے۔ پھر ماں جی بغیر کچھ بولے انھیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

شام کے بعد زینت نے انہیں اچھے کپڑوں میں برقع اوڑھ کر باہر جاتے بھی دیکھا اور واپس آتے بھی۔ رات کے دس بجے ہوں گے۔ جب وہ بانپتی ہوئی لوٹی تھیں۔ لیکن چہرے پر بشارت کے آثار تھے۔ انہوں نے برقع اتار کر کپڑے بدلے اور بغیر کھائے پینے چار پائی پر لیٹ گئیں۔ زینت نے کھانے کے لیے کہا تو بولیں۔ ”پروفیسر الطاف کے ہاں مبارک دینے گئی تھی۔ کھانا کھائے بغیر ان لوگوں نے اٹھنے تک نہ دیا۔“ اور پھر کروٹ بدل کر یوں سوئی ہیں۔ جیسے سارے دکھوں کو قبر میں اتار آئی ہوں۔

دوسری صبح جاگنے کے بعد ہی سے ان کے کان کوئی نئی خبر سننے کے لیے مضطرب تھے وہ ہر آہٹ پر چونکتیں۔ یہاں سے وہاں۔ اور ادھر سے ادھر انہوں نے بے قراری میں کئی چکر لگائے ہوں گے۔ زینت سے وکیل صاحب کی واپسی کے متعلق چار مرتبہ پوچھا ہوگا مگر وکیل صاحب وقت سے پہلے تو کیا آتے۔ وہ معمول سے بھی کچھ لیٹ ہو گئے۔ ماں جی رات گئے تک ان کا انتظار کرتی رہیں۔ بیس ایک بار تو انہوں نے کلاک دیکھا ہوگا۔ اس اضطراب میں بھی ان کے ویران چہرے پر کبھی کبھی نکھار ضرور آ جاتا تھا۔ شدت انتظار سے ان کا ذہن لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔ جب وکیل صاحب گھر میں داخ ہوئے ماں جی نے جاگتے میں دم سادھ لیا۔ وکیل صاحب کی آواز سننے کے لیے ان کے کان جل رہے تھے اور سارا خون چہرے پر آسمٹا تھا۔

”طبیعت کیسی ہے اب“ انہوں نے ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے صرف اتنا پوچھا۔

”پہلے سے کچھ ٹھیک ہے“ وہ بڑی آہستگی سے بولیں۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر فائلیں ترتیب دیتے رہے پھر سگریٹ سلگا کر انہوں نے کہا ”زینت کی ماں! ماں جی کو اپنی جوانی یاد آگئی جب وکیل صاحب انہیں ان الفاظ سے مخاطب کیا کرتے تھے۔

ہیں۔ ایک لڑکی جسے بیاہ نہیں سکتا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ سنو تو ہتھیلی سے پسینہ نکل آئے، وکیل صاحب رکے تو پہلے سانس ہی میں ماں جی کے سینے کا پتھر لڑھک گیا۔

”سچ پوچھو تو زینت کی ماں۔ بیٹی کا رشتہ ہو کر ٹوٹ جائے تو دل خون ہو ہو جاتا ہے۔“ کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وکیل صاحب نے بات آگے بڑھائی تھی۔

”بے چاری سلمیٰ“ ماں جی نے آہ بھر کر صرف اتنا کہا اور اپنے کمرے میں آنے کے لیے اٹھیں۔

وکیل صاحب منے چونک کر گردن گھمائی اور بے ساختہ بولے ”دوسری بات تو نامکمل ہی رہ گئی ہے“ کھنکار کھانس کر یوں تو انہوں نے گلا صاف کیا مگر حقیقت میں وہ بات کو ترتیب دے رہے تھے۔

”زینت کے رشتے کے لیے وہ لوگ پندرہ کی شام کو آ رہے ہیں۔“

”کون لوگ ہیں“ ماں جی سہم کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”نواب امجد حسین کے بیٹے کے لیے کافی دنوں سے رشتے کی تلاش ہو رہی تھی۔ سچ پوچھو تو مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔ اور پھر زینت کے لیے یہ رشتہ ہے بھی تو نہایت موزوں“ وکیل صاحب لہجہ بھر خاموش رہ کر بڑبڑائے۔ اللہ نیک نصیب کرے۔“ اس وقت ماں جی خوشی، حیرت اور غم کے ملے جلے تاثرات میں غرق دکھائی دیتی تھیں۔ اب تک رشید کی موت اور پھر سلمیٰ کی مگنوں نے زینت کی جوانی کو فراموش کر رکھا تھا۔ اب رشتہ طے ہوتے دیکھ کر انہیں اپنی غفلت کا شدید احساس ہوا۔ کہ وہ بکلا کر کرسی سے اٹھ بیٹھیں اور برآمدے سے گزرتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئیں۔

اپنے کمرے میں آ کر انہوں نے بغلی کمرے کا دروازہ کھولا اور سامان سے بھرے ہوئے تاریک کمرے میں داخل ہو گئیں۔ ٹٹول کر انہوں نے بتی روشن کی اور یہ دیکھ کر اطمینان محسوس کیا کہ کمرے کی ہر شے اپنی اپنی جگہ مناسب طریق سے رکھی ہوئی ہے۔ ہر چیز کو ایک نظر دیکھنے کے بعد انہوں نے باری باری دونوں بڑے ٹرنک کھولے، زینت کے جہیز کا سامان تھا۔ بڑی ہی آہستگی سے ان کا کانپتا ہوا ہاتھ صندوق میں رکھی ہوئی چیزوں کی طرف اٹھا اور ان سب چیزوں سے مس ہوتا ہوا تیرتا چلا گیا۔

بعض کپڑوں کو انہوں نے کھول کر دوبارہ تہہ کیا اور دوسری چیزوں پر لمبی سی پھونک مار کر یہ محسوس کیا کہ ان کی گرد صاف ہو گئی ہے۔ وہ پہلے سے بہت مطمئن تھیں، پھر بھی انہوں نے اقی چیزوں کا دل ہی دل میں حساب لگانا شروع کر دیا۔ مخمل کا ایک صوفہ، دو پلنگ، سنگھار میز، ڈائنگ سیٹ، الماریاں، ایک جوڑی بڑے صندوق۔ فرنیچر کو مکمل کر کے وہ سوچنے لگیں کون سی شے رہ گئی ہے اب۔ زیورات

پہلے سے تیار تھے کپڑے بھی بے شمار تھے اب صرف برات کا انتظام رہ گیا تھا۔ فرنیچر اور دوسری ضروریات کے علاوہ برات کے لیے وکیل صاحب نے آٹھ ہزار کی رقم بینک میں زینت کے نام سے الگ جمع کروا رکھی تھی۔ ماں جی نے سونے سے پہلے وہ چھوٹا سا ٹیپ کیس کھولا جس میں بینک کے کاغذات تھے۔ چیک بک کو ہاتھ سے صاف کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ رکھا اور بکس بند کر دیا۔ دوسری صبح بارہ تاریخ تھی۔ ماں جی پل پل گن کر گزارنے لگیں۔ سب سے پہلے انہوں نے نرسری سے دو درجن پھولوں والے گملے منگوائے اور انہیں ترتیب دیا پھر مکان کی جھاڑ پونچھ ہوئی ڈرائنگ روم میں فرنیچر کو نئے سرے سے سیٹ کیا گیا اور آنے والے مہمانوں کے لیے نیا ٹی سیٹ نکلا کر دھلوا یا پرانے برتنوں کو ٹین کے پیسے میں بند کر کے صندوق کے پیچھے چھپا دیا۔ ان سب کاموں سے فراغت حاصل کر کے وہ کمر سیدھی کرنے کے لیے بیٹھیں تو بارہ تاریخ کی دوپہر تھی۔ کم بخت وقت تھا کہ گزرتا ہی نہ تھا۔ تیرہ اور چودہ تاریخ کے دن انہوں نے انہی کاموں کو دھرانے اور سوچنے میں گزار دیئے۔ پندرہ کو وکیل صاحب بارہ بجے ہی کچہری سے لوٹ آئے زینت کو انہوں نے فوراً نہا کر لباس تبدیل کرنے کے لیے کہا اور خود بھی لباس تبدیل کرنے کے لیے اندر چلے گئے۔

زینت گھر کے اس نئے انقلاب کا عنوان تو تھی ہی مگر جب بھی اس نے نئے مہمانوں کے متعلق سوچا کہ وہ اسے دیکھنے آرہے ہیں تو اسے دیکھنے آرہے ہیں تو اسے اپنے آپ سے خوف محسوس ہونے لگا۔ پھر اس حد تک شرم کا احساس ہوا کہ اس کے کانوں کی لوہیں جلنے لگیں۔ وہ آج تک بیسیوں سہیلیوں سے ملی ہوگی۔ ان کے گھر مہمان بھی بے شمار آئے تھے۔ پاس پڑوس کی عورتوں کا جھگڑا بھی اکثر رہتا تھا مگر مہمانوں یا ملنے والوں سے نفرت کا جو احساس آج اس کے سینے میں سراٹھا رہا تھا پہلے نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو جانور تصور کرنے لگی تھی۔ اس سے اس کے شعور پر احساس کمتری کی ہلکی سی پرچھائیں بھی پڑی۔ اب تک اس نے چار بار آئینہ دیکھا ہوگا۔ اب جو آئینہ دیکھنے گئی تو اسے اپنے چہرے پر ملاحیت صباحت یا حسن کا ایک جزو بھی دکھائی نہ دیا۔ یہ عجیب احساس تھا جس نے چہرے پر پل بھر میں مردنی پھیلا دی تھی۔

اس نے سوچا۔ اگر لوگ چپ چاپ لڑکی دیکھ کر پسند کر لیں تو لڑکیاں بے چاری اس عذاب سے تو بچ جائیں کریں جس میں کہ وہ اس وقت مبتلا ہے۔ اس کے ہاتھوں کے تلوے جل رہے تھے سانس پھونکنی کی طرح جلنے لگی تھی اور جسم بخار کی طرح تپ رہا تھا۔ وہ اندھیرے کمرے میں جا کر اوندھے منہ چار پائی پر گر گئی اور تکیے میں منہ چھپا لیا۔

چار بجے کے قریب جب اس نے مرتب سا شور سنا تو اسے یقین ہو گیا کہ مہمان ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے ہیں۔ اس کا دل کچھ دیر کے لیے رک سا گیا اور اس قدر زور سے دھڑکا کہ اسے اپنے کان بجتے اور چھت گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خون ہو گیا۔

میں چیخنا چاہتا تھا مگر آواز حلق میں نہیں تھی رضیہ وحشت زدہ ہو کر اندر بھاگ گئی تھی اور سسٹر سنجانا بچے کی لاش کو جھک کر گھور رہی تھیں جیسے انہیں بھی بچے کی موت کے بارے میں کوئی شک ہو۔

اور جب وہ پانکتی سے کپڑا اٹھا کر لاش کو اوڑھ رہی تھیں تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ سسٹر سنجانا ڈاکٹر تھیں۔ سسٹر سنجانا رو رہی تھیں۔

میں انہیں اپنی پتھر ملی آنکھوں سے تکتا رہا، گھورتا رہا حتیٰ کہ میری دونوں ملازم ایک بعد دیگرے کمرے میں داخل ہوئے اور روتے ہوئے باہر چلے گئے میں نے ان کی طرف پلک اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ شاید اس لیے کہ سسٹر سنجانا کے آنسو بہانے اور ملازموں کے رونے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ملازم تو اپنے آقا کے دکھ پر رویا ہی کرتا ہے، دکھ محسوس کر کے نہیں آقا کو خوش کرنے کے لیے۔ مگر سسٹر سنجانا تو ڈاکٹر تھیں۔ میری ملازمہ تو نہیں تھیں۔ وہ روئے جا رہی تھیں اور میری آنکھیں نم بھی ہوئی تھیں۔ سسٹر سنجانا کس کو خوش کرنے کیلئے رو رہی تھیں شاید وہ اپنی خوشی کیلئے رو رہی تھیں۔ وہ میرے بچے کی موت پر بھی جی بھر کر روئی تھیں، مجھ سے زیادہ اسی دن سے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ دکھ برداشت نہیں کر سکتیں شرط یہ ہے کہ دکھ دوسروں کا ہو۔

میرا ذہن کتنی ہی دیر گم سم اور سو یا سو یا سا رہا۔ جب میرے حواس کسی قدر بجا ہوئے تو میرا جی مجھے بھرا بھرا محسوس ہونے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سسٹر مجھے روتا دیکھ کر یکا یک چپ ہو گئیں اور نڈھال ہوتی ہوئی رضیہ کو سنبھال دے کر کرسی پر بٹھا دیا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولیں۔

میں نے اپنی گیلی گیلی پلکوں کو اٹھا کر ان کی طرف غور سے دیکھا ان کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے ایک بار رضیہ کے شانے پر تھپکی دی اور کہا ”بس بس۔ زیادہ رونے سے بچہ واپس تو نہیں آئے گا۔ خدا کو یہی منظور تھا۔ مگر تم اتنا غم کیوں کرتی ہو۔ ابھی تو تمہارے ہاں بہت۔ بہت بچے ہو گئے۔ عمر کیا ہے ابھی تمہاری۔ خود بچہ ہو مگر اب بچہ نہ بنو نا۔ بس اب چپ ہو جاؤ اب رونا نہیں بالکل نہیں رونا!“

پھر وہ سسکیاں بھر بھر کر روتی ہوئی رضیہ کو چھوڑ کر میرے پاس آ گئیں اور مجھے رضیہ سے دور لے جا کر کہا ”میں اس بات کی معذرت ضرور کرتی کہ میرے دیر سے پہنچنے کی وجہ سے بچہ مر گیا۔ میں نے دیر ضرور کی تھی اور جس مریض کیلئے کی تھی وہ بے پناہ کرب

میں مبتلا تھا۔ اس کی چیخیں تو تم نے اپنے کانوں سے سنی ہیں۔ اس حالت میں میں اسے چھوڑ کر کیسے آسکتی تھی گو میرے وقتی علاج سے اس کی جان بچ سکے گی نہ مرض ہی ختم ہوگا۔ تاہم ہم اس کا کرب اس کی تکلیف۔ تو کچھ دیر کے لیے ختم ہوگئی تھی۔ یہی میری کوشش بھی تھی۔ وہ زندہ رہا ہے تو اپنی تقدیر سے۔ میں اس کا علاج نہ بھی کرتی۔ تو وہ زندہ رہتا۔

اسی طرح میں یہاں جو دیر سے پہنچی ہوں بچے کی موت کی وجہ ہرگز یہ نہیں۔ میں اس کے پاس بیٹھ کر بھی اس کی تیمارداری کرتی تو بھی بچہ مر جاتا اس کی زندگی ہی اتنی تھی۔ ”وہ رک گئیں۔ اتنا کچھ وہ ایک سانس لے کر کہہ گئی تھیں۔ رک کر انہوں نے دو قی لیے لیے سانس لیے جیسے بانپ رہی ہوں۔ پھر تھوک نکل کر کھانا سا ور کھنکارتے ہوئے بولیں۔ ”تم بھی تو کچھ بولو نا۔ چپ کیوں ہو بولو ایسے کام نہیں چلے گا۔ ایسے کام نہیں چل سکتا۔“ ان کی آنکھوں میں دکھ اور درد مندی کے احساس سے چمک سی آگئی تھی۔ انہوں نے پوٹے سمیٹ کر ایک منٹ تک چھت کو گھورا۔ اور پھر شفقت سے اپنا ٹھنڈا اور بھاری ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر مسکرانے کی ناکام کوششیں کرنے لگیں۔

”تم نے تو ابھی زندگی کی اونچ نیچ دیکھی ہی نہیں مسٹر۔ یہ تو ابتداء ہے ہمت ابھی سے ہار بیٹھے تو ان مشکلات کا مقابلہ کس طرح کرو گے جو مرتے دم تک تمہیں پیش آئیں گی بچپن سے لے کر تم نے شادی تک بڑی خوشگوار زندگی گزاری ہے۔ میں تم سے بھی زیادہ جانتی ہوں اور اب تک تم نے دو بچوں کی موت دیکھی ہے صرف اور دماغی توازن کھو دینا چاہتے ہو۔ میں جانتی ہوں۔ لخت جگر کا غم۔ بہت بڑا غم ہے لیکن تم تو مرد ہو۔“ میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے انہوں نے رک کر میرا جواب سننے کی آرزو کی۔ جب میں بدستور پتھر بنا رہا تو انہوں نے ہاتھ سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور اسی لہجے میں بولیں۔ ”دیکھو میں عورت ہوں۔ مجھے ہر روز لگوں کو مرتے دیکھنا پڑتا ہے میں انہیں مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ تم سمجھتے ہو گے کہ دوسروں کی موت پر کس کو دکھ ہوتا ہے؟ کیوں نہیں۔ ہسپتال کا کوئی مریض مرتا ہے تو میں سمجھتی ہوں میرا اپنا بچہ مرا ہے کیا ہوا اگر میں نے شادی نہیں کی تو۔ تم لوگ میرے بچے ہی تو ہو۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ خدا کو یاد کرو۔ وہ اپنے بندے کو امتحان میں ڈال کر اسی قدر تکلیف دیتا ہے جتنی اس کی برداشت میں ہو۔“

”کس خدا کی بات کر رہی ہیں“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

”ہش“ انہوں نے مجھے بات بڑھانے ہی نہ دی ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو خدا کے متعلق ایسے الفاظ زبان روکو۔ تمہارا بچہ مرا ہے ضمیر تو نہیں مرا اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہو۔ انہوں نے زبان کی نوک اگلے دانتوں میں ایک سیکنڈ تک دبائے رکھی اور پھر چھوڑ دی۔ اس کے بعد وہ یوں خاموش ہو گئیں جیسے گہری سوچ میں غرق ہوں چہرہ دونوں ہاتھوں سے اٹھائے زمین پر نظریں گاڑے وہ جتنی دیر بھی

بیٹھی رہیں ان کے چہرے پر تقدس اور معصومیت کا نور پھیلا رہا شاید وہ خدا کے وجود اور اس کی اہمیت پر غور کر رہی تھیں کیوں کہ خدا سے متعلق میں نے جو رکھی سے الفاظ استعمال کیے تھے یوں لگتا تھا جیسے سسٹر نے انہیں شدت سے محسوس کیا ہے۔ اس شدت سے کہ شاید وہ اب ہمدردی کا ایک لفظ بھی مجھ سے کہنا پسند نہ کریں گی اور واقعی وہ اپنے چہرے کی ساری معصومیت اور تقدس لیے انہیں ور چپ چاپ دروازے سے نکل گئیں دو گھنٹے بعد جب میرا ذہنی توازن بحال ہوا تو مجھے اس خیال سے بڑی ندامت ہوئی کہ سسٹر ناراض ہو کر چلی گئیں۔ شاید میں اس وقت ان کے پیچھے انہیں منانے چلا جاتا۔ مگر بچے کے کفن دفن کا انتظام کرنا تھا۔

دوسرے دن میں گھر پر ہی تھا اور سوچ ہی رہا تھا کہ سسٹر کے ہاں کب اور کیسے جایا جائے کہ دروازے پر ملکی سی دستک ہوئی اور اس کے فوراً بعد سسٹر اندر آ گئیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ اندر آ کر پہلے مجھے خدا پر ایک المبا چوڑا لپکھر دیں گی پھر ڈانٹ پلائیں گی اور بعد میں مجھے پیار سے گلے لگالیں گی۔ مگر وہ اندر آ کر چھوٹے ہی بولیں ”تم یقیناً آج نہیں نہائے۔“ بھی آج تو تمہیں گرم پانی سے نہانا چاہیے تھا۔ بولو نہیں نہائے نا؟“

میں نے جواب دینے کی بجائے خاموشی سے ان کی طرف دیکھا شاید وہ کل والی بات بھول چکی تھیں۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ میرے سامنے پڑی ہوئی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں اور کہا۔ ”جو بات پوچھی جائے اس کا فوراً جواب دینا چاہیے جانتے نہیں میں بڑی بہن ہوں اور پندرہ برس سے تمہاری ڈاکٹر ہوں۔ انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولیں ”ارے رضیہ کدھر ہے؟ طبیعت تو اچھی ہے اس کی؟ بلاؤ اسے ذرا۔ کہاں ہے وہ۔ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں اور ہاں سنو۔ وہ کرسی گھسیٹ کر قریب لے آئیں ”دیکھو“ انہوں نے اپنا منہ میرے کان کے قریب کر کے کہا رضیہ کو جس قدر جلد ہو سکے۔ کسی دوسری جگہ بھجواؤ طبیعت بہل جائے گی اس کی۔ آخر وہ ماں ہے۔ بچے کا غم اسے زیادہ ہوگا۔“ میں نے بے جان اور بے زار نظروں سے انہیں دیکھا شاید میری چپ سے انہیں وحشت ہونے لگی تھی۔ بولیں ”تم کیسے مرد ہو کہ خواہ مخواہ خاموش رہ کر اپنے غم کا پرچہ کر رہے ہو تمہاری ہمت، قوت اور مردانہ صفات کہاں چلی گئیں آخر؟ مرد تو سدا سے دکھوں غموں سے ٹکراتا اور خطرات سے کھیلتا آیا ہے اس نے تو زندگی کی روح ہی انہی چیزوں میں دیکھی ہے۔ تم ایک بچے کی موت نہیں سہار سکے۔ اٹھو۔ نہاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ تم دونوں ایک ہفتہ تک میرے مہمان ہو سبھی؟“

میں ساکت بیٹھا رہا تو انہوں نے زور زور سے میرا کندھا جھنجھوڑا بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کنپٹیوں کو سہلایا مگر میرے جسم کی حرارت تو جیسے برف میں دب گئی ہو۔ صرف کان تھے جن میں سسٹر سنا کی اواز گونج رہی تھی اور ذہن انہیں کسی حد تک قبول بھی کر رہا تھا۔

میں نے نظریں ان کی آنکھوں میں ڈبو دیں سسٹری آنکھوں میں خلوص تھا، گہری یگانگت تھی، محبت اور درد مندی تھی التجا اور اپنائیت غرض سبھی کچھ تھا جو ایک زخمی انسان کے لیے مرہم ہو سکتا ہے۔

میرے کندھے کو بار بار تھپتھپا کر انہوں نے مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کی اور پھر یکا یک جیسے انہیں رضیہ کا خیال آ گیا ہو۔ وہ انھیں اور اپنی مخصوص چال چلتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

جب میں اکیلا رہ گیا تو مجھے واقعی ان کی موجودگی کا احساس ہونے لگا اور پھر اس احساس نے کچھ اس قدر شدت اختیار کی کہ مجھے اپنی خاموشی پر ندامت اور افسوس ہونے لگا وہ میری بچپن کی ڈاکٹر تھیں مجھے ان کا کچھ احترام کرنا چاہیے تھا انہوں نے اپنی اولاد کی طرح میرا اور میرے بچوں کا مفت علاج کیا تھا اور اپنے بے پناہ پیار کی وجہ سے وہ میرے گھر کا فرد بن گئی تھیں۔ اس پیار میں بہن کا پیار تھا ماں کی شفقت تھی۔ باپ کا وقار تھا۔ گویا مجھے سب سہارے یکجا مل رہے تھے اور پھر میں نے بھی تو اس سے پیشتر ان کے سامنے ایسی طویل خاموشی نہ اپنائی تھی، کبھی ان کی بات کو غیر اہم نہ سمجھا تھا۔ مگر شدت غم سے مغلوب ہو کر آدمی بڑی سے بڑی شے کو اہمیت نہیں دیتا، کچھ ایسی ہی حالت میری تھی۔

جب وہ رضیہ کو کندھے سے لگائے میرے کمرے میں واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں مٹی کا ایک بچہ بھی تھا رضیہ کو صوفے پر آہستہ سے گرا کر انہوں نے مٹی کے بچے کا سر سہلانا شروع کر دیا جانے کیسے مجھے اس وقت سسٹر اور وہ مٹی کا بچہ بے حد پیارا لگا غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ بچے کو گود لینے کے لیے تڑپ اٹھے اور سسٹرو نے بچہ میری جھولی میں ڈال دیا۔

صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھ کر جھک کر انہوں نے کہا ”سنو میری بات“ تم دونوں اس بری طرح غم کے چنگل میں پھنس رہے ہو کہ مجھے تمہارے پاگل ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لیے تم لوگ ابھی اسی وقت میرے ساتھ چلو اب میں تمہیں ایک منٹ یہاں نہ رہنے دوں گی۔“ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ بولیں۔ ”اس گھر سے یقیناً تمہارا جی اکتا گیا ہوگا۔ یہ ویرانی، خاموشی، سناٹا، چپ چاپ تمہیں کیسے پسند آ سکتی ہے بھلا خنک کمرے میں بیٹھ کر کتنے ہی گرم آنسو بہاؤ مگر یہ زخم رسنا بند نہ ہوگا اس زخم کو تو وقت کا مرہم درکار ہے“ سمجھے میں تم دونوں سے مخاطب ہوں میرے ساتھ آؤ۔“

ان کی آنکھوں سے کچھ اس قسم کے جذبات چھلک رہے تھے کہ مجھے ان کی ارزو کا احترام کرنا پڑا۔ میں اسی طرح غیر رسمی کپڑوں میں اٹھ کھڑا ہوا۔ رضیہ بھی یہاں سے چلنے پر رضامند نظر آتی تھی تاہم وہ اس طرح چل رہی تھی جیسے گاؤں کی گنوار لڑکی اونچی ایزی کی جوتی پہن کر چل رہی ہو۔

ہم سسٹر کی آسٹن میں آ بیٹھے۔ کار میں بیٹھنے کے بعد کسی نے کوئے بات نہ کی۔ سسٹر چپ چاپ کار ڈرائیو کرنے لگیں۔

رضیہ اگلی سیٹ پر ان کے ساتھ سہی سی بیٹھی تھی اور میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا سوچ رہا تھا، سسٹر سبانا کتنی عجیب اور مخلص عورت ہیں پھر بھی وہ کہیں میری اس طویل خاموشی سے بر نہ مان لیں۔ ان کے احساسات و جذبات کی نزاکت اور ان کے ارادوں کی پختگی میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اس بے ربط سوچ کا تسلسل اس وقت ٹوٹا جب کار کو یک لخت بریک لگی اور میں بیٹھا بیٹھا اگلی سیٹ کی پشت پر جا گرا۔ سرد دروازہ کھول کر جلدی سے نیچے اتریں رضیہ کھڑکی سے سر نکال کر باہر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی میں نیچے اترتا تو سسٹر سبانا ایک زخمی پلے کو اٹھا رہی تھیں۔ سڑک کے ایک کنارے پر ایک کتیا اور ایک دوسرا پلا حیران نظروں سے سسٹر کی طرف دیکھ رہے تھے زخمی پلا چلا رہا تھا اس کی پچھلی دونوں ٹانگیں بری طرح کچلی گئی تھیں۔ سسٹر نے اسے اٹھا کر سڑک کے کنارے رکھا تو وہ اکھڑے اکھڑے سانس لینے لگا کتیا اس کا زخمی حصہ چاٹنے لگی۔ دوسرا پلا ایک پل کے لیے آگے بڑھا، اس نے زخمی بھائی کو سونگھا اور پھر دو گز پرے جا کھڑا ہوا۔ سسٹر نے اپنی نم آلود پلکیں اٹھائیں اور خون آلود ہاتھوں کو رومال سے صاف کرتے ہوئے بولیں۔ ”ماں پر کیا بیت رہی ہوگی، بے چاری منہ میں اٹھا کر سڑک پار کر رہی تھی۔ مگر اس کی یہ کارروائی بھی کسی کام نہ آ سکی۔ ایک کو سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچا کر یہ واپس نہ پلٹی تھی کہ یہ دوسرا خود ہی بھاگ کر سامنے آ گیا“ کار سے بیگ نکال کر جلدی جلدی پٹی روٹی اور دیگر اشیاء نکالیں اور پلے کے زخم صاف کرنے لگیں۔ مگر وہ چند منٹ بھی جی نہ سکا پلا مر گیا تو وہ مجرموں کی طرح گردن جھکائے کچھ دیر سڑک کے کنارے کھڑی اسے تکتی رہیں پھر یوں واپس چلنے لگیں جیسے جوان بیٹے کو لحد میں اتار کر پلٹی ہوں۔ کار میں بیٹھ کر انہوں نے ایک بار اداس نگاہوں سے کتیا کی طرف دیکھا اور جلد ہی منہ پھیر لیا۔ جیسے انہیں کتیا سے آنکھ ملانے کی تاب نہ ہو۔

جب وہ کار سٹارٹ کر رہی تھیں تو مڑ کر انہوں نے مجھ سے کہا ”تم نے سوچا تو ہوگا کہ سسٹر بعض اوقات بچوں کی طرح دکھائی دیتی ہے اور پھر شاید تم یہ بھی سوچو کہ کم و بیش اتنا ہی دکھ مجھے پلے کی موت کا کیوں ہوا ہے جس قدر تمہارے بچے کی موت کا ہوا تھا۔ مجھے بچہ کہہ لو۔ جو جی چاہے کہہ لو۔ مگر میں کہوں گی کہ کتے اور انسان میں فرق ہی کتنا ہے؟ اول تو ہے ہی نہیں اور اگر تم کوئی فرق نکال بھی لو تو میرے نزدیک وہی فرق ہوگا جو انسان اور فرشتے میں ہے۔

”فرشتہ اور کتا“ میں حیران ہو کر کچھ کہنے لگا تو وہ جلدی سے بولیں ”پہلے پوری بات سن تو لو۔ سنو۔ فرشتوں میں کس قدر تقدس اور پاکیزگی ہوتی ہے اس کے باوجود وہ انسان سے اشرف نہیں اور نہ ہی انسان کی برابری کر سکتا ہے، بس یہی فرق تمہیں کتے اور انسان میں دکھائی دے گا۔“

میں نے اگلی سیٹ کی پشت پر جھک کر پوری توجہ سسٹر کی بات سننے کی طرف مبذول کر دی۔

”کتنا بعض مقامات پر انسان سے بہتر نظر آتا ہے لیکن رہے گا وہیں کا وہیں جہاں فرشتہ انسان سے نیچے رہ جاتا ہے۔ اور بہتر اور ارفع کہلا کر بھی انسان کی گرد کو نہیں پہنچتا خیر یہ تو الگ بحث ہے۔ تم یوں سمجھو کہ کسی جان دار شے کا دکھ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اور پھر ہمدردی سے انحراف کسے ہے اور انکار کسے؟ یہ تو وہ جذبہ ہے جسے طوفان نوح بھی نہ مٹا سکا تھا۔“

وہ ایک منٹ تک خاموش رہیں اور سڑک کا موڑ کاٹتے ہوئے بے حد احتیاط سے کام لیا پھر بولیں۔

”کتیا بے چاری کی متاثر تپتی تو ہوگی۔ میں ڈاکٹر ہوتے ہوئے اس کا دکھ نہیں جان سکتی، یا جانتی ہوں تو میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ کتیا کے دل کا حال تو رضیہ جانتی ہوگی۔“

رضیہ نے یہ جملہ سنا تو سسک پڑی۔

”لو بھلا“ سسٹر بولیں۔ ”میرا مطلب یہ تھوڑے ہی تھا کہ تم رونا شروع کر دو کتیا نے بھی تمہارے سامنے کوئے آنسو بہایا ہے؟

بس یہی فرق ہے جو اسے تم سے بلند کر رہا ہے۔ تم انسان ہو اور صبر تم سے کوسوں دور معلوم ہوتا ہے۔ چپ ہو جاؤ ناب۔“

رضیہ واقعی چپ ہو گئی۔

”شاید تم اپنے آپ کو کتیا سے کم تر نہیں سمجھنا چاہتیں۔“

سسٹر سببانے مسکرا کر کہا۔

رضیہ کے چہرے پر ایک لمحہ کے لیے روشنی کی کرن نمودار ہوئی اور مسکراہٹ بن کر لبوں پر پھل گئی۔

اور شاید اسی مسکراہٹ میں اضافہ کرنے کے لیے سسٹر نے کہا ”ہماری رضو تو کتیا سے کہیں اچھی ہے۔“

سسٹر کا مکان آ گیا۔

انہوں نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر کے رضیہ کو بازو سے پکڑ کر یوں اتارا جیسے نئی نویلی دلہن کو اتار رہی ہوں گیٹ کے

اندر ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا شاید اس لیے سسٹر نے برآمدے کی سیزھیاں چڑھتے ہوئے کہا ”دیکھنا تین ہیں“ مجھے اس بات پر ہنسی

آگئی میں ہی نہیں رضیہ بھی اکثر اوقات یہاں آچکی تھی اور ہم جانتے تھے کہ برآمدے کی سیزھیاں تین ہیں۔

ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔

کمرے کی فضاء کافی حد تک گرم اور مانوس تھی۔ آتش دان میں کونکلوں کی بجائے ہیٹر رکھا تھا جو دکھ رہا تھا۔ آتش دان کے دائیں

طرف ایک چھوٹی سی خوبصورت میز رکھی تھی اس پر ایک سبز شیڈ کا لیمپ جل رہا تھا۔ جس سے فرش پر چاندنی سی بکھر گئی تھی۔ ہم میز کے گرد رکھی ہوئی گدے دار کرسیوں پر جا بیٹھے۔

سسٹر دومنٹ کی اجازت چاہ کر اندر گئیں تو میں نے کارنس کی تصویروں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ میں ان تصاویر کو بار بار دیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود میں انہیں بغور دیکھنے لگا۔

ایک طرف سسٹر کی بچپن کی تصویر رکھی تھی ایک چھوٹی سی بچی گلے میں رومال باندھے کتابوں کو سینے سے لگائے مسکرا رہی تھی اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت اور بوڑھے مرد کی تصویریں علی الترتیب رکھی تھیں کارنس کے درمیان ایک خوبصورت سا چراغ جل رہا تھا جس کے چاروں طرف تازہ پھول رکھے تھے۔

سسٹر واپس آ گئیں اور بولیں۔ ”مادام کو دیکھنے لگی تھی کل سے ان کی طبیعت بھی منمحل ہے۔“

”ٹھیک ہیں اب کچھ ٹھیک ہیں ابھی سب ان سے جا کر ملیں گے۔“

سسٹر مسکرائیں اور کارنس پر رکھی ہوئی تصویروں کے پاس چلی گئیں پھر انہوں نے بوڑھی عورت کی تصویر کو ہاتھ میں لیا پھونک مار کر اس پر پڑی ہوئی گرد کو صاف کیا اور کہنے لگیں۔ ”یہ تصویر دیکھی ہے تم نے بالکل تازہ ہے پندرہ دن ہوئے میں نے اپنے ہاتھ سے اتاری تھی کیسی ہے؟“

”اچھی ہے بہت اچھی ہے۔“ میں نے اور رضیہ نے تقریباً ایک ہی بات کہی۔

”پہلی سے بھی اچھی ہے نا“ انہوں نے مزید پوچھا۔

میرا ذہن پہلی تصویر کی طرف چلا گیا وہ تصویر بھی مادام کی ہی تھی تاہم کچھ پرانی تھی۔ میں نے کہا ”اس تصویر سے تو یہ بہت زیادہ اچھی ہے۔“ سسٹر چمک کر ہنس پڑیں۔ ”مگر وہ پہلی بھی تو میں نے ہی اتاری تھی۔“

انہوں نے میرے ہاتھ میں تصویر تھما دی اور کارنس پر رکھی ہوئی باقی دونوں تصویریں بھی اٹھالائیں اور انہیں میز پر ایک زاویے سے سجا کر بولیں ”تم نے آج تک ان تصاویر کے بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا؟“

مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے بولنے پر اکسار رہی ہوں۔

”ایک تصویر تو آپ کی اپنی ہے اور دوسری“

انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا ”ہاں مگر اس کے بارے میں یہ تو پوچھا جاسکتا ہے تاکہ کب اتاری کس نے اتاری یہ مادام نے

اتاری تھی۔ میں اس وقت چھ برس کی تھی۔ ہوں۔ اچھا تو دوسری تصویر؟“

”وہ آپ کے ڈیڈی کی ہے شاید!“ میں نے فوراً کہا ”جو زندہ نہیں ہیں۔“

سسٹر نے اتنے زور سے قہقہہ لگایا کہ میرے ذہن سے غم کی ساری کلفت دھل گئی چمکتے ہوئے انہوں نے بوڑھے آدمی کی تصویر کی طرف اشارہ کیا اور کہا ”میں نے ٹھیک کہا تھا نا۔ کہ تم نے کبھی کوئی سوال نہیں پوچھا۔ اس سے میری مراد یہ تھی کہ تم اس تصویر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ارے بھائی یہ تو میرے ماموں ہیں۔ ابھی زندہ ہیں اور کیلے فوراً نیا میں ہیں۔“

”تو آپ کے ڈیڈی کی تصویر کہاں ہے پھر؟“ رضیہ نے اچانک سوال کر دیا۔

سسٹر کے چہرے پر پھیل ہوئی تمام شگفتگی آہستہ آہستہ سنجیدگی کی تہہ میں دب گئی انہوں نے کرسی گھسیٹ کر آگے کرتے ہوئے کہا ”وہ اس قابل ہی کہاں تھے کہ ان کی تصویر کو اپنی ماں کی تصویر کے ساتھ کارنس پر جگہ دی جاسکتی۔“

رضیہ کچھ بولی نہ میں ہم نے تجسس سے بھری نگاہیں سسٹر کے چہرے پر جمادیں۔

وہ پہلے مسکرائیں پھر کچھ دیر خلاؤں میں گھورتے ہوئے کھوسی گئیں اور بڑے ہی دھیمے لہجے میں گویا ہوئیں ”وہی تو ایک شخص ہے۔ جس نے مادام کی پھولوں بھری زندگی میں انکارے پھیلانے ہیں۔ عورت کی زندگی کے وہی لمحے تو حسین اور اچلے ہوتے ہیں جو وہ شوہر کے ساتھ گزار کر خوشی محسوس کرے۔ بقیہ زندگی تو انہی لمحوں کی یاد میں بھی بسر ہو سکتی ہے وہی لمحے ڈیڈی نے میری ماں کو دکھ دینے میں گزارے ہیں۔ یوں جیسے انتقام لے رہے ہوں۔ ان باتوں کی بنیاد کوئی بھی نہیں تھی بس یہی۔ کہ میں مرد ہوں۔ اور تم عورت میں ان باتوں کا ذکر کرنا نہیں چاہتی اور نہ ہی انہیں دہرا کر تمہارے اور اپنے دکھ کو بڑھانا چاہتی ہوں۔ بس تم اتنا جان لو کہ جب ماں نے ان کے بے پناہ مظالم سے تنگ آ کر علیحدگی اختیار کر لی اور مجھے ان کی بعض وہ باتیں بھی بتائیں جو میں اس سے پہلے نہیں جانتی تھی۔ تو مجھے دنیا بھر کے مردوں سے نفرت ہو گئی۔ میں نے زندگی کا ایک حصہ مردوں سے نفرت کرنے میں گزارا ہے اور پھر شادی نہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے یہ نفرت میرے اندر جڑ پکڑ گئی اور نفرت کے اس درخت کی کونپلوں نے مجھے ڈھانپ کر اس دنیا سے بالکل الگ تھلگ اور علیحدہ کر دیا یا شاید مجھے وہ زندگی پسند نہ تھی جسے میری ماں نے محکوم بن کر گزارا تھا۔ تم ہی کہوں میں کیسے ایک مرد کو زندگی بھر کا ساتھ دینے کے لیے منتخب کر لیتی؟ ہر مرد کا ذہن بنیادی طور پر تقریباً ایک ہے۔

ماں نے زندگی سے سیندور مانگا تو اسے راکھ ملی۔ کلیوں کی آرزو میں خزاں کے زرد پتے اس کے گلے کا ہار بنے اور روشنی کی ان کرنوں کو جسے انہوں نے مستقبل میں حاصل کرنے کے خواب دیکھے اندھیروں کے اڑدھا چاٹ گئے پھر تم ہی کہو نا۔ رک کر انہوں نے

ایک منٹ تک توقف کیا اور پھر تھوک نکل کر بولیں۔

”پھر میں نے اپنے آپ سے یہ عہد بھی تو کر رکھا ہے کہ مادام کے دکھوں کی تلافی کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دوں گی اور اس کمی اور خلا کو پر کرنے کی کوشش کروں گی۔ جو مادام کی زندگی کا لیبہ ہے۔ شادی نہ کرنا بھی تو ایک قربانی ہی ہے نا؟“ انہوں نے یوں میری طرف دیکھا جیسے میری رائے معلوم کرنا چاہتی ہوں۔

”بہت بڑی قربانی سسر“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

انہوں نے اس چھوٹے سے جملے پر زیادہ توجہ نہ دی بلکہ ٹیبل لیپ کے سبز شیڈ پر انگلی سے الٹی سیدھی لکیریں کھینچتے ہوئے بولیں۔
”بعض اوقات مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ میں ابھی تک اپنے آپ سے کیے ہوئے اس عہد کو ثابت قدمی سے نباہ رہی ہوں۔ خدا کرے یہ زندگی اس عہد کو پورا کرتے ہوئے تمام ہو میں اپنی ماں کی بیٹی ہوں، بیٹا بھی، خاوند بھی، چاہنے والا بھی ان سب رشتوں کو نباہتے ہوئے مجھے ان کی پامال اور ادھوری آرزوؤں کو پورا کر کے ایک انجانی اور ان مٹ خوشی ہوتی ہے اس وقت میں اپنے آپ میں وزن محسوس کرتی ہوں اور مجھے اپنے آپ پر رشک آنے لگتا ہے۔“

”مادام بلا رہی ہیں“ ملازم نے دروازے کا ایک پٹ کھول کر صرف اتنا کہا تو سسر نے بات اور کرسی وہیں چھوڑ دی۔ ایک لمحہ کھڑے رہ کر انہوں نے کچھ سوچا۔ پھر گھڑی دیکھی اور بولیں۔

”مجی چائے پر بلا رہی ہیں شاید۔۔۔۔۔۔ آؤ سب چلیں۔“

ہم اٹھے اور چپ چاپ ڈرائنگ روم سے نکل کر برآمدے سے ہوتے ہوئے ایک خاص کمرے میں چلے آئے۔ جہاں واقعی مادام بے سوری پہیوں والی کرسی پر بیٹھی ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔

آداب کہہ کر میں اور رضیہ ایک میز کے گرد کھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مادام بے سوری اپنی پہیوں والی کرسی کو آہستہ آہستہ چلاتی ہوئیں ہمارے قریب لے آئیں اور اپنی سجھی سجھی اور بے جان آنکھوں سے رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

”میری حالت تو تم سے چھپی ہوئی نہیں ورنہ ضرور تمہارے بچے کی تعزیت کرنے آتی میری بچی! امید ہے تم اس بات کو نظر انداز کر دو گی اور تم بھی۔“ انہوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ میرے دل میں آیا کہ میں کہوں، مادام آپ شرمندہ کر رہی ہیں، سسر نے آپ کی کسر پوری کر دی ہے۔ مگر میرے سینے میں جو مدوجز رہ پھیلا ہوا تھا اس نے مجھے کچھ بولنے نہ دیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں کس طرح ان کے محبت بھرے، پر خلوص جذبات کا جواب دوں شاید میرے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ میں گردن جھکائے خاموش بیٹھا

جب ملازمہ چائے کی ٹرے لیے اندر آئی تو اس نے چائے میز پر رکھنے سے پہلے سسٹر سے کہا۔ ”ڈاکٹر بروچ اور رنجنا آ رہے ہیں۔“

ڈاکٹر بروچ سے میں پہلے بھی کئی بار مل چکا تھا اور اس کی لڑکی رنجنا سے تو سرراہے ملاقات ہوتی رہتی تھی ملازمہ کے واپس جانے سے پہلے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئے اور مادام بے سوری کی مزاج پر سی کرنے کے بعد مجھ سے گرجوٹی سے ہاتھ ملایا اور خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

مادام بے سوری نے کوئی بات کرنے سے پہلے ہی انہیں میرے بچے کی موت سے آگاہ کر دیا۔ ڈاکٹر بروچ نے اظہارِ غم کیا، رنجنا نے کچھ سوالات پوچھے اور خاموش ہو گئی۔ ان کے چہروں کے اتار چڑھاؤ سے میں ان کے جذبات کا اندازہ بخوبی لگا سکتا تھا۔ چائے پیتے ہوئے کسی نے کوہِ بات نہ کی۔ بس چپ چاپ چائے پیتے رہے۔ اور اس کے بعد بھی کسی نے کوئی ایسی بات نہ کی جس میں مزاج اور گفتگو کا عنصر ہو۔ آہستہ آہستہ دھیمے لہجوں میں زندگی اور موت کے فلسفے پر گفتگو تو ہوئی مگر تفریح کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ بات گھما پھرا کر میرے بچے کی موت پر آ جاتی تھی اور سب کے چہرے لٹک جاتے تھے۔

یہ محفل دیر تک قائم رہی اور اس وقت درخواست ہوئی جب سسٹر کے ڈپنٹری جانے کا وقت ہو گیا۔ میں اور ضیہ سسٹر کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتے ہوئے ہال کمرے میں آ پہنچے۔

یہ کمرے اپنی خوبصورتی کی وجہ سے بالکل الگ نظر آتا تھا۔ کمرے کے بالکل درمیان ایک خوبصورت قالین بچھا تھا جس پر ایک منقش تپائی رکھی تھی اور اس تپائی کے درمیان ایک سنہری چراغ جل رہا تھا۔ چراغ شیشے کی ایک چھوٹی سی چار دیواری میں رکھا تھا۔ اس الماری کے دونوں طرف لکڑی کے بنے ہوئے گلدان تھے جن میں زیادہ تر گلاب کے پھول رکھے تھے اور شیشے کی بنی ہوئی چار دیواری کے اوپر بھی سنہری تاروں سے بنا ہوا ایک ہار جگمگا رہا تھا چراغ کی زرد زرد روشنی کچھ تپائی پر اور کچھ قالین پر بکھی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بلاشبہ اس اندھیرے میں بڑا ہی تقدس تھا۔ آج سے دس برس پہلے مجھے اچھی طرح یاد ہے میں اس کمرے میں ماں جی کے ساتھ آیا تھا تو بھی یہ چراغ اسی طرح جل رہا تھا۔ کمرے کی فضا وہی تھی صرف جھولتے ہوئے بو جھل پردوں کا رنگ کچھ پھیکا پڑ گیا تھا۔

اس کمرے سے ملحق ایک چھوٹے سے کمرے کو لائبریری کا روپ دیا گیا تھا۔ اس کے بالکل ساتھ سونے کا کمرہ تھا۔

رضیہ اس وقت سونا چاہتی تھی میں نے اسے سونے کے کمرے میں بھیج دیا اور خود لائبریری میں آ بیٹھا۔

جب لائبریری میں آدمی تنہا ہوا اور کتابوں سے تھوڑی سی دلچسپی ہو تو کتابوں کو الٹ پلٹ کرنے کے علاوہ اور کیا کرے گا۔

میں نے بھی یہی کچھ کرنا شروع کر دیا۔ باری بار ہر الماری کو کھولا ایک ایک کتاب کو ہاتھ میں لیا، ورق الٹائے اور پڑھا۔ میری معلومات میں ایک یہ بھی اضافہ ہوا کہ سسٹر کن کن کتابوں کا مطالعہ کر چکی ہیں۔ ایک ایک لائن کو غور سے پڑھا گیا تھا، نشانات اور جملوں پر تبصرہ ہر کتاب میں موجود تھا، تحریر سسٹر کی تھی۔ کیٹس، بائرن، شیلے سے لے کر اقبال، عمر خیام اور مثنوی مولانا روم تک کے نسخے موجود تھے پھر فلسفہ، تحقیق، تاریخ حتیٰ کہ انجیل اور قرآن کو بھی بڑے احترام سے رکھا ہوا تھا۔ دنیا کی ہر شے اور ہر کتاب سے دلچسپی رکھنے والی سسٹر سنا۔۔۔۔۔ اس وقت مجھے کچھ اور بھی عجیب دکھائی دیں۔ کرسی سے ٹیک لگا کر میں نے آنکھیں موند لیں۔ میں اس وقت تھکن محسوس کر رہا تھا۔

شاید میری آنکھ لگ گئی تھی۔ جب میں نے دوبارہ جاگ کر گھڑی دیکھی تو دس بج رہے تھے اور میں لائبریری میں ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ کچھ لمحوں بعد ہی میں نے محسوس کیا جیسے کوئی سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہو۔

بیٹھے بیٹھے میں نے گردن گھما کر ہال کمرے کی طرف دیکھا۔ سسٹر سنا جلتے ہوئے خوبصورت چراغ کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں اور سرگوشیوں میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں نے لائبریری کی بتی بجھا کر ہال کمرے کا پردہ اچھی طرح ہٹا دیا۔ سرگوشیاں آہستہ آہستہ آواز کا روپ دھارنے لگیں۔ پھر ان کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

”میں صرف تیری دی ہوئی عقل اور شعور سے ان کا علاج کر رہی ہوں۔ شفا دینے والا تو وہی ہے جس کا تو روپ ہے۔ جب تک تیری مرضی اور خوشی شامل نہ ہو دووا کچھ نہ کر سکے گی، تو انہیں صحت دے، انہیں معاف کر دے، بخش دے۔ وہ بے حد کرب میں مبتلا ہیں“ سسٹر سنا پہلے سے زیادہ جھک گئیں اور یوں گڑ گڑانے لگیں جیسے اگر ان کی دعا قبول نہ ہوئی تو وہ ابھی رونے لگیں گی۔ میری نظروں میں تھوڑی دیر کے لیے یونان کے وہ قدیم حکما گھوم گئے جو صبح کو مریضوں کو دوا دے کر رات بھر ان کی صحت کے لیے داکیا کرتے تھے لیکن وہ تو پرانا زمانہ تھا۔ اس دور اور اس دور میں تو صدیوں کا فرق تھا یہ فرق ایک لمحے میں کیوں کر مٹ سکتا تھا سسٹر اس صدیوں پرانی دیوار کونحوں میں کیسے پھلانگ رہی تھیں۔

میں اٹھ کر سونے کے کمرے میں چلا آیا اور بغیر مزید کچھ سوچے سو گیا۔

صبح جس وقت سسٹر مجھے جگا رہی تھیں۔ سورج کی سنہری سنہری کرنیں روشندان سے اندر جھانک رہی تھیں۔ رضیہ مجھ سے پہلے

[illegible]

سسر نے جب ہمیں رخصت کرنے کے لیے کار کا دروازہ کھولا تو ان کا چہرہ اداس سا تھا۔ رضیہ کو تو انہوں نے یوں سہارا دے کر کار میں سوار کرایا جیسے اپنی بیٹے کو ڈولے میں اتار رہی ہوں۔ پھر انگلی سیٹ پر آ بیٹھیں اور کار سنارٹ کرنے کی بجائے مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولیں ”میں چاہتی تو یہی تھی کہ تم لوگ ابھی نہ جاؤ، مگر رضیہ کا اصرار بھی ہے اور حالات کا تقاضا بھی۔ انسان کبھی ایک جگہ خوش نہیں رہ سکتا، ڈاکٹر ہوں نا، ہر مرض کی تشخیص کرنے کے لیے بڑی احتیاط کرتی ہوں۔ تم لوگ جس مرض میں مبتلا تھے۔ اس کا علاج کرنے کی میں نے پوری کوشش کی ہے اور اب یہ تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آنا بھی تمہارے علاج میں داخل ہے۔ ورنہ کچھ دن تو ضرور تمہیں مجبور کر کے روکتی“ کار سنارٹ کرتے ہوئے انہوں نے ہارن بجایا اور کہا ”ذرا پیچھے نگاہ رکھنا کوئی پلا تو نہیں۔ اس دن کے بعد میں اکثر سوچتی ہوں کہ آج تک کسی جانور نے مجھ سے میری کار سے دکھ نہیں اٹھایا۔ یہ پلا کیسے میری کار کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ میں ابھی تک اسے نہیں بھول سکی۔ وہ اکثر مجھے یاد آتا ہے بے چارہ!“

گھر کے دروازے پر ہم جب کار سے اترے۔ تو سسر ہمیں اندر تک چھوڑنے آئیں اور پھر واپس ہوتے ہوئے بولیں ”میں تھوڑی دیر ضرور یہاں رکتی مگر مادام بیمار ہیں۔ ان کی طبیعت اکثر ٹھیک نہیں رہتی جیسا کہ تم جانتے ہو۔ خیر تم فکر نہ کرو۔ میں آؤں گی میں آیا کروں گی۔ روز آیا کروں گی“ پھر وہ رضیہ سے مصافحہ کر کے چلی گئیں۔

سسر سنجانا کے قریب ہفتہ بھر رہ کر رضیہ نے مذہب کا اثر بڑی شدت سے قبلو کیا تھا اور باقاعدہ نماز بھی پڑھنے لگی تھی۔ میں نماز تو نہیں پڑھتا تھا لیکن مذہب کے بارے میں مطالعہ کرنے میں پہلی جو چیز مانع تھی۔ غالباً اس کا وجود تو پہلے بھی نہ تھا، تاہم کوئی غیر مرئی شے، فرار کی سی صورت میں میرے اندر موجود ضرور تھی، جواب نہیں تھی۔ میں اب مطالعہ ضرور کرنے لگا تھا اور وہ بھی خالصتاً مذہبی کتب کا۔

دو تین مہینے گزر گئے۔ سسر اکثر و بیشتر آتیں اور چلی جاتیں۔ ان کے آنے سے ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں حرارت سی آ جاتی طبیعت شگفتہ اور بہلی بہلی سی رہتی اور جب وہ نہ ہوتیں تو ان کے آنے کا انتظار رہتا۔

پھر ایک دن اچانک مجھے دفتر میں فون پر اطلاع ملی کہ سسر سنجانا ہسپتال کی میڈیسیوں سے پھسل کر زخمی ہو گئی ہیں دفتر سے نکلتے نکلتے مجھے ایک گھنٹہ لگا۔ میں ہسپتال پہنچا تو سسر بستر پر اوندھے منہ لیٹی تھیں مجھے دیکھ کر انہوں نے سیدھا ہونے کی کوشش کی اور کراہ کر رہ گئیں۔ بظاہر جسم کا کوئی حصہ زخمی نظر نہ آ رہا تھا۔ میں چپ چاپ پاس پڑی ہوئی چوکی پر بیٹھ گیا انہوں نے مجھے دیکھ تو بہت پہلے لیا تھا۔ مگر دیر بعد بولیں ”کمر میں جیسے کسی نے چاقو گھونپ رکھا ہو۔ جب سے گری ہوں۔ یہ دیکھو۔ یہاں“ انہوں نے میری انگلی پکڑ کر

اپنی ریڑھ کی ہڈی پر ایک خاص جگہ رکھی ان کے لبوں سے آہی نکل گئی۔ سسٹر نے مسکرانے کی کوشش کی تو ان کے چہرے پر کرب اور درد کے نشانات اور بھی ابھر آئے۔ نچلے ہونٹ کو دو ایک بار دانتوں سے کاٹ کر انہوں نے پوچھا ”رضیہ تو نہیں آئی نا؟“

”نہیں“ میں نے کہا۔ ”مگر سسٹر یہ سب“ میں نے مزید کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے مجھے ہاتھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولیں۔ ”تم کچھ مت کہو میں جانتی ہوں تم کیا جاننا چاہتے ہو۔ تم یہ سب کچھ بعد میں پوچھ لینا فی الحال جلدی سے گھر جاؤ اور رضیہ کو مادام کے پاس چھوڑ آؤ وہ بیمار ہیں تمہارا بڑا احسان ہوگا۔“

سسٹر کی آواز ان کے بھینچے ہوئے ہونٹوں میں گھٹ کر رہ گئی ان کے ماتھے پر پسینے کے سوتے پھوٹ رہے تھے جیسے کسی نے ان کی پیشانی پر سپرے کر دیا ہو۔ میں رضیہ کو مادام کے پاس چھوڑ کر پھر ہسپتال چلا آیا۔ میرے آنے تک سسٹر کی کمر کا ایک رے لیا جا چکا تھا۔ مگر ایکس رے کا ریزلٹ فیصلہ کن نہ تھا ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق نہ تو ہڈی ٹوٹی تھی نہ گوشت پھٹا تھا مگر آخر تھا کیا یہ کوئی بھی نہ کہہ سکا۔

ایک دن دو دن آٹھ دن!

مرض کی تشخیص ہی نہ ہو سکی تھی۔ صرف۔ پاسٹر لگانے سے اس قدر فائدہ ضرور ہوا تھا کہ سسٹر سیدھا لیٹ سکتی تھیں۔ مگر اٹھ کر بیٹھنے میں پہلے دن کی طرح درد تھا۔

پھر جب ایک ماہ بیت گیا اور مرض اور علاج کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو سسٹر مجھے اس روز بہت اداس دکھائی دیں۔ کہنے لگیں۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ قدرت اس معمولی سی چوٹ پر اتنا بڑا پردہ کیوں ڈال رہی ہے۔“ وہ یہ بات کہتے ہوئے بے حد سنجیدہ تھیں اور جب ایک منٹ بعد ہی نرس دوا لے کر آئی تو سسٹر نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے کہا ”کس مرض کی دوا لائی ہو؟ بھلا موت کا بھی کوئی علاج ہے!“

ان کے لہجے میں بے انتہا مایوسی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے اندر زندگی کی امنگ سسک رہی ہو زندہ رہنے کی امنگ مر رہی ہو۔ اس ایک ماہ کے اندر شاید وہ اس لیے زیادہ مایوس ہو گئی تھیں کہ کئی ایکس رے لیے جا چکے تھے۔ انجکشن لگائے گئے تھے خون ٹیسٹ کیا گیا تھا مگر سب بے سود۔ درد ایک جگہ ایک نکتے پر گائے کے سینک کی طرح گڑا تھا۔ پھر ایک دن مادام بے سوری اپنی پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر رضیہ کے ساتھ بڑھاپے اور بیماری میں ہسپتال آ گئیں۔ اس سے پہلے کہ مادام کچھ پوچھیں اور سسٹر کچھ بتائیں سسٹر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اپنی تکلیف سے تو وہ ایک دن بھی نہ روئی تھیں۔ غالباً مادام کے چہرے پر بیٹی کا دکھ محسوس کر کے جذبات کے سہارے جو تاثر منتقل تھا، سسٹر کے رونے کا سبب تھا۔

سسٹر روتی رہیں ہم سب گہرے رنج میں ڈوبے خاموش بیٹھے رہے اور میں نے تو یہ بھی سوچا کہ کتنی معمولی بات کتنی بڑی بات بن جائے گی۔ اسی روز شام کو سسٹر ہسپتال سے گھر روانہ ہو گئیں۔

گھر آ کر ان کی حالت اس حد تک سنبھل گئی تھی کہ درودن کے بعض حصوں میں کم ہو جاتا اس وقت سسٹر کی آنکھوں میں زندگی کی چمک آ جاتی۔ زندہ رہنے کی وہ امنگ جو تکلیف کی حالت میں دب سی گئی تھی، نیا روپ لے کر دوبارہ بیدار ہو جاتی۔ ان کا چہرہ روشن ہو جاتا اور وہ مسکرا کر اپنے دیرینہ مریضوں کی بابت پوچھنے لگتیں۔

سسٹر سنجانا کے بیمار رہنے کی وجہ سے ان کے معاشی حالات بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ نوکری یوں ہاتھ سے گئی۔ اپنی پریکٹس آہستہ آہستہ تقریباً ختم ہو گئی۔ گھر آنے کے بعد انہوں نے مشکل سے ایک ماہ صبر کیا اور پھر زندگی کے اس چکر کو جاری رکھنے کے لیے لیٹ کر پریکٹس جاری کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میرے نزدیک یہ بات کسی صورت بھی قابل قبول نہ تھی، مادام بھی مجھ سے متفق تھیں۔ مگر سسٹر نہ مانیں انہوں نے ایک دن اپنی ذاتی ڈسپنری میں بستر لگوا یا اور مکان سے ملحق ڈسپنری میں بستر پر لیٹ کر مریضوں کو پھر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ مگر یہ سلسلہ پہلی کی طرح نہ چل سکا۔ کیوں کہ مریضوں کی تعداد سسٹر کی غیر حاضری کی وجہ سے پہلے ہی کم ہو چکی تھی اور اب سسٹر بعض دن تکلیف کے باعث مریض نہ دیکھ سکتیں اس سلسلے کو بھی آخر کار تیسرے ماہ بند ہی کرنا پڑا۔ حالانکہ سسٹر بھند تھیں کہ میں لیٹ کر آسانی سے مریض دیکھ سکتی ہوں۔ مگر مریض ہوتے تو وہ انہیں دیکھتیں۔

یہ سلسلے بھی منقطع ہو گیا تو سنجانا سسٹر نے کار بیچ دی اور حاصل شدہ رقم مادام بے سوری کے نام بینک میں جمع کرا دی۔ ڈاکٹر بروچ دوسرے تیسرے دن آتے تھے۔ کبھی کبھی رنجنا بھی آتی تھی اس کے علاوہ سسٹر کا حلقہ احباب مختصر سا تھا جو چند ایک بوڑھی پاری عورتوں پر مشتمل تھا۔

ڈاکٹر بروچ نے ایک روز مجھے علیحدہ لے جا کر کہا ”میں سنجانا کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ خود دار قسم کی عورت یہ بات کسی صورت بھی تسلیم نہ کرے گی۔ کیا تم سنجانا کو مناسکتے ہو؟“

”میں کوشش کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”یہاں کوشش کا رآمد ہو سکتی تو میں خود کوشش کرتا، کوشش نہیں کوئی ترکیب ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر بروچ رازدارانہ لہجے میں کہہ رہے

قریب کرسی پر بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔ میرے آنے سے قبل وہ شاید سسٹر کا معائنہ کر چکے تھے۔ سسٹر سناٹا ایک ہاتھ تو کمر کے نیچے رکھے درد سے چلا رہی تھیں اور مادام بے سوری سہمی سہمی سی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی چھت کو گھور رہی تھیں۔ میں اتنا وحشت زدہ ہو گیا تھا کہ حادثے کی تفصیلات پوچھے بغیر چپ چاپ چار پائی کی پابنتی پر ہی بیٹھ گیا۔

ہم سب سراسیمگی کے عالم میں بیٹھے تھے کوئی کسی سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟ سب کے چہرے اسی کی طرح نہ میری انگلی پکڑ کر کمر پر لگائی نہ مسکرائیں اور نہ رضیہ کو مادام کے پاس لے آنے کا مشورہ دیا۔ بس چپ چاپ روتی رہیں۔ ڈاکٹر بروچ نے یکے بعد دیگرے سسٹر کو مارفیا کے دو انجکشن دیے۔ اس سے اس قدر فائدہ ضرور ہوا کہ سسٹر پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔

دوسری دن میں رات کو دیر سے سسٹر کے ہاں پہنچا تو سسٹر ابھی جاگ رہی تھیں۔ لیکن ان کی حالت پھر بھی اچھی نہ تھی ریڑھ کی ہڈی کا درد لحظہ بہ لحظہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پہلے ہی اس درد نے سسٹر کے لیے بے زاری مایوسی اور بے پناہ تکلیف کا سامان پیدا کیا تھا اور اب یہ دوسرا حملہ تو پہلے سے کہیں زیادہ سخت معلوم ہو رہا تھا۔

مادام بے سوری بھی پہلے سے کہیں زیادہ پریشان تھیں۔ شاید اس لیے کہ ان کی جوانی بھی دکھوں اور تکلیفوں میں جیتی تھی اور اب بڑھاپا بھی نئی ڈگر سے ہٹ کر بھیا تک راستوں پر آ نکلا تھا۔

میرا خیال تھا کہ پہلے حادثے کے بعد جس طرح سسٹر کی طبیعت کچھ مدت بعد کسی حد تک سنبھل گئی تھی شاید اس بار بھی ایسا ہی ہو مگر میرا خیال غلط نکلا سسٹر کو بستر پر پڑے روتے چاتے دو ماہ گزر گئے لیکن وہ ایک منٹ کے لیے بھی نہ سو سکیں۔ مسلسل کراہنے سے ان کے چہرے کے نقوش تک بدلے جوئے محسوس ہوتے تھے۔ بعض اوقات تو وہ پہچانی ہی نہ جاتی تھیں۔ جسم سوکھ کر کاٹا ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر ہی اندر دھنستی چلی جا رہی تھیں اور بال یوں الجھ گئے تھے جیسے ان میں سال ہا سال سے کنگھی نہ کی گئی ہو۔ کچھ دن اور گزر گئے۔

اسی دوران میں مجھے ایک ہفتے کے لیے باہر جانا پڑا۔ اصولاً مجھے ان دنوں نہیں جانا چاہیے تھا۔ سسٹر کی حالت بے حد خراب تھی۔ گیا تو میں ایک ہفتے کے لیے تھا۔ مگر پانچویں روز ہی لوٹ آیا۔ گھر پہنچ کر میں نے سب سے پہلے رضیہ سے سسٹر کی خیریت ہی پوچھی۔ لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے دبیز ٹکڑے ٹھنڈی اور بو جھل ہو امیں جھول رہے تھے۔

رضیہ کو تنہا چھوڑ کر میں سسٹر کے ہاں چلا آیا۔

سسٹر کی پہلی نگاہ سے ہی میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ان کی طبیعت پہلے سے بھی خراب ہے ان کی آنکھیں رو رو کر پتھر بن رہی تھیں چہرہ سو جا سو جا اور زرد تھا۔

”کیسی طبیعت ہے سسٹر؟“ میں نے فرش پر پاؤں کے بل بیٹھ کر سسٹر کے بالوں کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔

سسٹر جواب میں کراہیں تو مجھے فوراً اور شدید احساس ہوا کہ مجھے یہ رسمی سوال بالکل نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ سسٹر نے جواب دینے کی بجائے ہولے ہولے جان اور پھکی نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ میں اس وقت ان بے نور اور پتھریلی آنکھوں کی تاب بھی نہ لاسکا۔ خود بخود میری نظریں جھک گئیں تو سسٹر ایک لمبا ہنکارا بھر کر بولیں۔

”حال پوچھتے ہو؟ کیا حال کہوں تم سے!“ وہ ایک پل رک کر چپٹ کو گھورتی رہیں پھر آہستہ آہستہ دھیمے لہجے میں بولیں ”پچھلے دو ماہ سے میں نے راتوں کو رو رو کر اس عظیم طاقت سے دعائیں مانگی ہیں۔ اس کے سامنے منتیں مانی اور التجائیں کرہیں اور آخر کار جب کچھ بن نہیں پڑا۔ تو میں پرسوں سے گڑ گڑا گڑا کر اس کائنات کو بنانے والے سے موت مانگ رہی ہوں۔ مگر یوں نظر آتا ہے کہ مجھے موت کی بھیک بھی نہیں ملے گی بعض اوقات تو میرا ذہن یہ سوچنے لگتا ہے کہ شاید یہ سب کچھ اس کے اختیار میں نہیں اور اگر ہے تو وہ مجھے ایک رات کی فیند کیوں نہیں بخشا؟ مجھے چند لمحوں کے لیے بھی سکون نہیں دے سکتا۔ کیوں؟ میری دعائیں... التجائیں کیا ہوئیں؟ رو رو کر اتنی سخت تکلیف میں نے اس خدا کو یاد کیا ہے۔ پھر اس سے زندگی نہیں موت مانگی ہے۔ اس نے میری استدعائیں اتنی بے دردی سے کیوں ٹھکرا دی ہیں۔ آخر کیوں آخر کیوں؟“ وہ رک گئیں تو ان کے آنسو آہستہ آہستہ ریگتے ہوئے ان کے زرد زرد گالوں پر پھسلنے لگے۔ ان کی آواز سسکیاں بننے لگی۔ آنسو پونچھتے ہوئے وہ پھر گویا ہوئیں ”میں نے زندگی بھر کسی کا دل نہیں دکھایا کسی کو ستایا نہیں بلکہ میں نے زندگی کا بیشتر حصہ لوگوں کی تکلیفیں رفع کرنے کی کوشش میں گزارا ہے۔ پھر میں نے اس خدا کو اس عظیم قوت کو... اس خالق کو... رنج میں دکھ میں خوشی میں پریشانی اور کسی بھی حالت میں دل سے جدا نہیں کیا۔“

سسٹر نے آنکھیں موند لیں۔ اس وقت ان کی سانس بڑی تیز تیز چل رہی تھی پیشانی پر بے شمار سلولیں ابھر اور مٹ رہی تھیں اور ہونٹ انہوں نے دانتوں میں دبوج لیے تھے۔

مادام بے سوری نے اپنے نحیف و زار جسم کو جنبش دی اور آہستہ آہستہ سر کا کر سسٹر کے قریب ہو گئیں۔ سسٹر کی کلائی پر ہاتھ پھیر کر انہوں نے کہا۔ ”حوصلہ کرو میری بچی تم آج بھی اسی خدا کو پکارو... جس سے تمام زندگی تم نے مدد مانگی ہے اب بھی اسے ہی پیش نظر

رکھو۔ وہی دکھ کو سکھ کی شکل دے سکتا ہے۔“

”مہی... سسٹر کی آواز میں جوش تھا۔ میں اس وقت ایسی باتیں نہیں سوچ سکتی۔ مجھے تو اس وقت سرطان کے اس مریض کے الفاظ سنائی دے رہے ہیں جس نے اپنی زندگی کی شمع بجھنے سے چند لمحے پہلے مجھے کہا تھا ”مجھے یہ سب کچھ ڈھونگ نظر آتا ہے۔ اول تو اس طاقت کا وجود ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو وہ آسمانوں زمینوں کو پیدا کرنے والا رحم دل نہیں۔ وہ تو پہاڑ جیسا دل رکھتا ہے۔ اس کے دل میں نہ رحم ہے نہ درد۔ میری حالت اس سے چھپی تو نہ ہوگی۔ اگر وہ رحم دل ہے تو مجھ سے زیادہ رحم کا مستحق کون ہو سکتا ہے۔“ مادام جے سوری نے سسٹر کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا ”وہ مریض تو سرطان کی وجہ سے پاگل ہو گیا تھا۔ تم تو پاگل نہیں۔ تم اس کے الفاظ کیوں دھرا رہی ہو۔ ہوش میں آؤ اور خاموش رہو میں چراغ لاتی ہوں اسے سامنے رکھ کر خدا سے معافی مانگو اس طرح کی باتیں تمہاری تکلیف کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی عذاب کا باعث ہوں گی۔ بیٹا ذرا بڑا چراغ اٹھا لاؤ اندسے۔ آخری جملہ انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

میں چراغ لے آیا تو مادام جے سوری نے اسے سامنے رکھ کر اس کے چاروں طرف پھول رکھے اور ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کر لیں کچھ دیر وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی رہیں۔ پھر آنکھیں کھول کر سسٹر نے ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے مجھے کہا ”میں پانی پیوں گی مجھے پانی پلاؤ۔“

میں پانی کا گلاس لے کر اندر آیا تو انہوں نے اٹھنے کی معمولی سی کوشش کی۔ بیماری ہونے کے بعد یہ پہلی کوشش تھی جو سسٹر اٹھنے کے لیے خود کر رہی تھیں۔ ورنہ اس سے پہلے تو اٹھ کر بیٹھ جانے کا احساس ہی انہیں رلا دیتا تھا۔ مگر جانے ان میں کون سی طاقت آگئی۔ کہ وہ میرے اور تکیے کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

مادام جے سوری کے ہونٹ مسرت سے پھیلنے جا رہے تھے۔ شاید وہ اسے اپنی دعا کا کرشمہ سمجھ رہی تھیں۔

سسٹر نے پانی کا گلاس خود ہاتھوں سے تھام کر لبوں سے لگایا اور ایک سانس میں آھا گلاس پی گئیں۔

پھر انہوں نے عجیب وحشت ناک نگاہوں سے چراغ کو گھورنا شروع کر دیا۔ اس چراغ کو انہوں نے آج تک دن رات پوجا تھا اس کے سامنے دعائیں اور التجائیں کی تھیں۔ اس آگ کو دیوتا مانا تھا خدا کا روپ کہا تھا ہار پہنائے تھے۔ مکان کے ہر کمرے میں اس کے روپ کو زندہ رکھا تھا جو خدا کا روپ اور زرتشت کی تعلیم تھا اور جسے انہوں نے بچپن سے آج تک بھجنے نہ دیا تھا۔ انہوں نے اس بڑے سے چراغ کو سنہری لوگوں کو دوا ایک بار ہاتھ سے چھوا اور پھر تڑپ کر گلاس کا بچا ہوا پانی اس پر گرا دیا۔



سیدھا راستہ

یہ اڑا اس کے لیے سونے کی کان تھا۔

مگر یہاں آنے سے پیشتر وہ کئی دن تک سوچتا رہا تھا اور کسی خاص فیصلے کے تحت آج کی رات اس کان کو دے رہا تھا۔

پہلوان سے قوام لگے پتوں کا ایک چوکڑا لے کر اس نے دونوں کلوں میں دبایا اور دو چوکڑے بندھوا کر ساتھ لے لیے سگریٹ اس نے پہلے سے بھر رکھے تھے اور یہ سب سامان بھیگ جانے کے انتھار کی کوفت سے بچنے کے لیے تھا۔

پان چوہستا اور قوام کا مزہ لیتا وہ دوبار اس اڈے کے قریب سے گزرا تھا۔ دوسری مرتبہ گزرتے ہوئے ایک لمحے میں اس نے صحیح جگہ کا انتخاب کر لیا تھا اور مطمئن ہو کر پلٹ آیا تھا۔

یہاں اس بازار میں بھیڑیوں سمٹ آئی تھی جیسے ابھی یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ گا ہک اور گاہکوں کو پھانسنے والے گورے کالے نانے لمبے سبھی قسم کے انسان یہاں موجود تھے۔ کچھ دیر کے لیے تو ہیرا ان میں یوں گھل مل گیا جیسے اس کے یہاں آنے کا مقصد محض تفریح ہو۔

ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور پھر دوسرے سرے سے پہلے تک آتے آتے اس نے دیکھا کہ کچھ دیر پہلے جو کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ اب ایسا نہیں ہے اور لوگوں کی تعداد بہت حد تک کم ہو گئی ہے۔

پھر جب منی بائی نے بالکونی کے ساتھ الی کھڑکی کا پردہ گرایا تو اس نے جان لیا کہ بارہ سے اوپر کا عمل ہے۔

اس وقت رات کا دوسرا حصہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسے معلوم تھا۔ اور منی بالی کے علاوہ سرور پگھر اچ، جاکلی، نرگس اور دوسری بہت سی بایاں پاؤں سے گھنگرو اتار پھینکتی ہیں۔ سارنگیوں پر غلاف چڑھ جاتے ہیں۔ اور بالکونیوں کے دروازے بند ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ جن بالکونیوں کے دروازے نہیں ہوتے، ان کے پردے کھل جاتے ہیں اور پھر گرم گرم سانسوں کے درمیان ... رات بھیک جاتی ہے۔

اسے ایسی بھی بہت سی بانیوں کا علم تھا جو رات کے پہلے پہر ناچتی تھیں۔۔۔۔۔ اور دوسرے پہر نچواتی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے انتخاب شدہ اندھیرے کوٹنے میں کھڑا ہے جہاں سے اسے سڑک کا آخری حصہ تک دکھائی دے رہا ہے جس کے

آس پاس زندگی سمٹ رہی ہے۔ سمٹی جا رہی ہے۔

دودھ والا ابھی ابھی دکان بڑھا کر جا چکا تھا۔ ہوٹلوں کی گھسی پٹی ریکارڈنگ بند ہو چکی تھی۔ چرس کے بھرے بھرائے سگریٹ بیچنے والے بند دکانوں کے تھڑوں پر اونگھ رہے تھے۔ کبھی کبھی ایک آدھ مالشیے کی آواز بھی سنائی دے جاتی۔ چوراہے میں پہلاؤں پان والا ابھی تک گلو ریاں بنا رہا تھا اور پان کے ٹوکروں میں رکھے ٹھروں پر پان کی پچی کچھی کترنیں اور سگریٹ کی خالی ڈبیاں پھینک رہا تھا۔

ہیرا آدھ گھنٹے سے اس کونے میں کھڑا اپنے آخری پان چبا رہا تھا۔ چرس بھرے سگریٹ اس کی جیب میں تھے نیفے میں اڑسا ہوا لمبا چاقو آستین میں سلا ہوا دس کانوٹ جو اس نے ہنگامی حالات کے لیے دفن کر رکھے تھے۔ پاؤں میں پیچ کی چپل اور گندھوں پر پرانا کمبل۔

اسے اپنا فیصلہ اچھی طرح یاد تھا اور اس کی ساری احتیاط اس کے فیصلے کے تحفظ کے لیے تھی۔

ممکن ہے.. اس نے سوچا... مجھے نیکی کے راستوں پر پناہ ملے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ نیکی کا صرف ایک راستہ ہوگا اور میں اسی راستے کی تلاش میں بھٹک گیا تھا اور آج اسی راستے کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔

سرودی سے ٹانگوں کا خون منجمد ہونے لگا تو ایک بند دکان کے برآمدے میں پاؤں کے بل بیٹھ کر اس نے کمبل سے اچھی طرح اپنے آپ کو لپیٹ لیا۔ پھر بڑی احتیاط سے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ نکالا اور ہونٹوں سے چپکا کر ماچس ٹٹولنے لگا۔

ماچس جلانے کے فوراً بعد اس نے آنے والے کے قدموں کی چاپ سنی تو جلتی تیلی کو پھینکار سے بچھا دیا اور سانس روک کر تھوڑی سی گردن دکان کے برآمدے سے باہر نکالی... آنے والا.... ابھی منی بانکی کے مکان سے سو گز پرے تھا۔ اس نے بڑی آہستگی سے ماچس نکالی اور سگریٹ سمیت برآمدے کے ایک کونے میں ڈال دی۔ پھر اپنا کمبل اتار کر زمین پر رکھا اور نیفے سے لمبا سا چاقو نکال کر منٹھی میں بھینچ لیا۔

اس کی نگاہیں راہ گیر کے ہر قدم پر جمی تھیں۔ وہ ہر لحظہ چوکنا ہو رہا تھا۔ وہ راہ گیر کے قدم گننے لگا۔

”ہک...“ دبی دبی مگر بھیا تک سی آواز اس کے حلق سے اٹلی اور اس کے ساتھ ہی اس نے چاقو فضا میں لہرا دیا۔

راہ گیر اتنی تیزی سے گھوما کہ گر پڑا... سنبھلا مگر اٹھ نہ سکا۔ اس کے سر پر موت کا اشارہ تھا۔

ہیرا اس گرے ہوئے انسان پر جھک کر کھڑا ہو گیا۔ ”سب کچھ نکالوں۔“ اس نے دبی آواز اور قہر آلود نگاہوں سے کہا۔

”میرے پا!.... میرا پاس صرف۔“ مسافر ہکلا یا۔

”جو کچھ بھی ہے۔“ ہیرا تھوڑا اور جھکا۔ ”جلدی... جلدی“ چاقو والا ہاتھ مسافر کے سر پر برابر منڈلا رہا تھا۔ مسافر نے تیزی سے ہاتھ جیب میں ڈالا اور جیب میں بکھری ہوئی چیزوں کو ایک لمحے میں سمیٹ کر مٹھی باہر نکال لی۔

”لو...“ وہ بولا۔

ہیرے نے دونوں ہاتھوں سے اوک بنانے کی بجائے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پھیلا دی۔

مختلف چیزوں کے اس چھوٹے سے اجتماع کو دیکھ کر اسے دکھ ہوا۔

ایک نیا پیک شدہ بلنڈ سینما کی مسلی ہوئی ٹکٹ کا آدھا حصہ ایک کنگھی فلمی گانوں کی ایک کاپی بھنے ہوئے چنوں کے چند دانے اور نقد دس نئے پیسے۔

کوٹ پتلون میں ملبوس اس مسافر سے ہیرے کو یہ توقع نہ تھی۔ اسے سخت کوفت ہوئی۔

غصے اور کوفت کے ملے جلے جذبات کو دبا کر اس نے دھیمی آواز سے پوچھا۔ ”کیا کام کرتے ہو؟“ پھر اس نے خود ہی بات

بڑھائی ”جو کچھ پوچھوں بتاتے جاؤ۔“

”کھڑک ہوں۔“

”کیا تنخواہ لیتے ہو؟“

”تنخواہ تو خیر سوا سو ہے“ وہ مسافر خوشگوار حیرت سے ہیرے کی طرف بکتے ہوئے بولا ”آٹھ افراد کا کنبہ ہے اور پھر ہیڈ کلرک کو

ماہوار بھی دینا پڑتا ہے۔ بچے سکول جاتے ہیں۔ ماں بیمار ہے سدا کی اور بہنیں جوان ہو رہی ہیں۔“

”کیوں؟“ ہیرے نے اس کی بات روک دی۔ ”ہیڈ کلرک ماہوار کیوں لیتا ہے۔“

”نہ دیں تو ہماری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔ میرے علاوہ دوسرے کلرک بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔“

”اور تم سینما دیکھ کر آئے ہو؟“

”آج پہلی تاریخ ہے نا۔ اس دن مجھے پانچ روپے ذاتی خرچ کے لیے ملتے ہیں۔ اور اسی دن ختم ہو جاتے ہیں۔“

”پتا“

مسافر نے پتا بتا دیا۔

تحتی۔

اس کے خیال میں جمن خاں کی حویلی سے نکلنے والا سایہ بھی کسی رئیس کا تھا اور اسے محتاط کر دینے کے لیے کافی تھا۔ سایہ یوار ٹٹولتے ہوئے کچھ دور چلا اور پھر دیوار کی طرف منہ کر کے موری پر بیٹھ گیا۔

ہیرے کو اسے پیشاب کرتے دیکھ کر ہنسی آ گئی۔

”سالا“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”کیوں نہ اسے وہیں پکڑ لوں۔۔۔۔۔ مگر نہیں۔۔۔۔۔ اس کا انتظار کرنا چاہیے۔“

وہ دیوار کے ایک ابھرے ہوئے حصے کے ساتھ چپک گیا۔ ایک لمحہ چند لمحے سایہ لفظ بہ لفظ قریب آ رہا تھا، جھومتا جھومتا۔

مگر جانے وہ کیسا راہ گیر تھا کہ اس نے ہیرے کو دیکھا ہی نہیں۔ برابر چلتا گیا۔

ہیراپک کر پھر سامنے آیا اور اسے گریبان سے پکڑ کر بولا۔ ”ساری شراب نکال دوں گا۔“ دوسرے ہاتھ سے اس نے کھلے چاقو کی نوک اس کے پھولے ہوئے پیٹ میں چبھو دی۔

مسافر واقعی نشے میں دھت تھا۔ وہ ایک لمحے تک تو نشے ہی میں رہا پھر جب ہیرے نے اس کے گریبان کو دو ایک جھٹکے دیے تو اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

رندھی ہوئی آواز میں چلا کر اس نے کہا ”میں بال بچے دار ہوں۔“

نوک اس کے پیٹ میں تھوڑی سی اور چھوکر ہیرا بولا۔

”آواز بند-----مال ادھر-----!“

”مال۔۔۔۔۔؟“ وہ آدھی منہ پھاڑ کر بولا۔ ”مال کہاں ہے میرے پاس؟ میرے پاس تو کوڑی بھی نہیں۔ سب اس نے لے لیے۔“ اس نے پچھلی سمت اندھیرے میں اشارہ کر کے کہا۔ ”اس نے“

ہیرا سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ”کس ماں کو دے کر آیا ہے؟“ ایک دھول جما کر ہیرا بولا ”جیب ادھر کر“

ہیرے نے بڑے اطمینان سے اس کی سب جیبوں کی تلاشی لی۔ آخری جیب جھاڑتے ہوئے ٹھن سے انٹنی سڑک پر بھی اور ٹھنک ٹھنک نان----- کرتی ہوئی ریگ گئی۔

اٹھنی کی آواز کو ہیرے نے اچھی طرح پہچان لیا تھا اور پھنکار تے ہوئے اس موٹے آدمی کے سر پر زور کا ایک ہاتھ مار کر دھکا دیا

”میں گانا سنے آیا تھا۔“

”تم...“ ہیرے حیران ہو کر پوچھا۔۔۔۔۔ ”تم گانا سننے آئے تھے!“

”ہاں میں آیا تھا“ لڑکا بولا۔ ”میرے پاس دو ہزار روپے تھے۔“

”تم ابھی بہت چھوٹے دکھائی دیتے ہو۔ اتنی رقم تمہارے پاس کہاں سے آگئی؟“

لڑکا ایک منٹ کے لیے پریشان سا ہو گیا۔ شاید وہ اس سوال کا جواب نہ دینا چاہتا تھا، یا اس کے پاس اس سوال کا جواب تھا ہی نہیں!

”فکر نہ کرو۔“ ہیرا اسے چکار کر بولا۔ ”تمہیں اب کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سب کچھ صاف صاف کہہ دو۔ گھر سے لیا تھا؟“

”اول ہوں“ لڑکا بولا۔

”پھر؟“

”چوری کی تھی؟“

”چوری؟ تم چوری کر سکتے ہو؟“

”ہاں! ہم نے چوری کی تھی۔“

”مگر تم چور ہو کر اس آدمی سے ڈر گئے؟“

”ہم نے چوری ضرور کی تھی۔ مگر ہم چور نہیں ہیں۔“

”چوری کرنے والا تو چور ہی ہوتا ہے۔“

”مگر... مگر...“ وہ لڑکا ایک پل تک رکا رہا۔ پھر بولا ”ہم نے تو مذاق مذاق میں ایک آدمی کو نقلی پستول دکھایا تھا۔ بس وہ ڈر گیا

... اور اپنا تھیلا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس تھیلے میں ہماری امید کے خلاف آٹھ ہزار روپے کے نوٹ تھے۔ ہم نے دو دو ہزار تقسیم کر

لیے۔“

”پولیس نے تمہیں کچھ نہیں کہا؟“ ہیرے نے جیب سے سگریٹ نکالا اور پنچوں کے بل زمین پر بیٹھ کر اتنا جھکا کہ تیلی جلنے سے

روشنی اس کی جھولی ہی میں سمٹ گئی۔ ایک لمبا کش لے کر اس نے سگریٹ مٹھی میں اس حد تک چھپا لیا کہ گہرے اندھیرے کے باوجود

سگریٹ کی روشنی دبیز تاریکی میں گھل مل گئی۔ اس نے بڑے اطمینان سے بات آگے بڑھائی۔ ”دوسرے دن پولیس تو اس جگہ آئی ہو

”ہاں! ہاں پولیس آئی تھی۔ مگر شینال پارک میں جو کچی آبادی ہے نا؟ وہ تو وہاں آئی تھی اور وہیں سے انہوں نے چار پانچ آدمیوں کو گرفتار بھی کر لیا تھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے روپے چھیننے کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔“

”تمہارے سب ساتھی محفوظ رہے؟“

”جی ہاں... پولیس انہیں پکڑ نہیں سکتی تھی۔“

”وہ کیوں؟“ ہیرے نے حیران ہو کر پوچھا۔

اس لیے کہ... ”وہ لڑکا اسی لہجے میں بولا۔ ”وہ سب کے سب شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی یعنی“ اس لڑکے کو ایک لمحے تک کوئی معقول لفظ نہ ملا۔ پھر اس نے کہا... ”یعنی وہ سب کے سب رئیس خاندانوں سے تھے اور پھر سب کے سب بڑے آفیسروں کے لڑکے تھے۔ میں خود پولیس کے....“

اس سے پہلے کہ لڑکا اپنے والد کے متعلق کچھ بتائے ہیرا بولا... ”تم تو بڑے کام کے آدمی ہو۔“

”کیوں نہیں؟ ہم نے ایک باریکسی والے کو بھی“

”خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تم یہ کہو کہ یہ روپے تم نے خرچ کیسے کیے؟“

”وہ تو سب کے سب بار میں شراب پینے چلے گئے تھے۔“ لڑکا بولا... ”اور میں گانا سننے چلا آیا...“

”سنا پھر گانا؟“

”ہاں... گانا تو سنا تھا۔ گھر والوں کے ڈر سے میں نے سارا روپیہ تو چھوٹی والی کو دے دیا۔ پھر جب صبح کے تین بجے اور میرا روپیہ بالکل ختم ہو گیا تو طبلہ بجانے والا شخص مجھے اپنے ساتھ یہاں لے آیا تھا۔ اس نے مجھے ایسے سگرٹ پلائے کہ مجھے چکر آ گئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس نے میرے سارے کپڑے اتار دیے۔ مجھ میں کچھ بولنے تک کی سکت نہ تھی۔ دوسرے دن دوپہر کے بعد جاگا، تو میرے جسم پر سارے کپڑے موجود تھے۔ مگر کمرہ باہر سے بند تھا۔ میں نے دو ایک بار دروازہ بھی کھٹکھٹایا مگر مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ دوپہر سے لے کر اب تک میں اس آدمی کا انتظار کرتا رہا تھا۔ یہ تمام وقت میں بے اکڑوں بیٹھ کر گزارا ہے، حالانکہ میرے جسم کا ہر حصہ دکھ رہا تھا۔ اب اس آدمی نے دروازہ کھولا ہے تو میں نکل بھاگا ہوں۔ اب یہ میرے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ کہ آپ کو دیکھ کر بھاگ گیا۔ آپ کون ہیں؟“

”میں کوئی بھی ہوں۔“ ہیرا بولا۔ ”اسے چھوڑو... تم اب کیا چاہتے ہو... تمہیں گھر چھوڑ آؤ... میں تمہیں گھر چھوڑ آتا۔“ ہیرا خود ہی بول پڑا... ”مگر مجھے اس وقت بہت ضروری کام ہے۔ اگر تم تھوڑی دیر انتظار کر سکو تو اس گلی کی بغل میں پیر پاشا کا مزار ہے۔ وہاں بیٹھو میں فارغ ہو کر تمہیں ابھی گھر چھوڑ آتا ہوں۔“

لڑکا مزار کے دروازے پر ایک منٹ کے لیے جھجکا مگر پھر اندر چلا گیا۔

ہیرے نے سگریٹ کا کش لے کر نگاہ اٹھائی تو مخالف سمت سے بوسیدہ کبل اوڑھے کوئی شخص جھکا جھکا چلا آ رہا تھا۔ ہیرا اس وقت ذرا بھی نہ چونکا۔ اس نے چاقو فضا میں لہرانے کی ضرورت محسوس کی نہ ہی مٹھی میں دبائے ہوئے سگریٹ کو دور پھینکنے کی کوشش! اس نے پہلے کی طرح نہیں بلکہ بڑے سلیقے سے کہا۔

”جناب ذرا سنیے۔“

کبل میں لپٹا لپٹا یا آدمی قریب آ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔

ہیرے نے آہستہ سے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے چہرے سے کبل ہٹایا۔ یہ آدمی بالکل نو جوان دکھائی دیتا تھا مگر اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، جڑوں کی ہڈیاں نمایاں اور پھر اس گہرے اور سرد اندھیرے میں اس کی زرد رنگت صاف دکھائی دے رہی تھی۔

”آپ کے پاس کتنے پیسے ہیں جی“ ہیرے نے بڑی نرم آواز میں پوچھا۔

”پیسے؟ میرے پاس؟“ نو جوان نے اتنے زور سے قہقہہ لگایا کہ مزار کے اندر بیٹھا ہوا لڑکا چونک کر گلی میں آ گیا۔ مگر گلی سے باہر آنے کی جرات اسے بھی نہ ہوئی۔

ہیرا کچھ دیر تک حیرت سے اس نو جوان کا چہرہ تکتا رہا۔ پھر ذرا تفتی سے بولا۔ ”بکو اسی کتے.... آہستہ بول۔“

مگر نو جوان اسی آواز میں ہنستا چلا گیا۔ اسی دروان میں اس کے ہاتھ سے کوئی چیز گر پڑی۔ دونوں اس شے کی طرف لپکے۔ ہیرے نے دیکھا وہ کتابیں تھیں جنہیں اس نو جوان نے جلدی سے اٹھالیا تھا۔ پھر گہری سنجیدہ آواز میں اس نے کہا۔ ”میرے پاس پیسے ہوتے تو میں اس پتھر بلی سردی میں کھبے کے نیچے کھڑے ہو کر پرھنے کی بجائے گھر میں دیا جلا لیتا“ اس نو جوان کے چہرے پر اتنا کرب انداز تھا کہ کچھ اور کہنے کی بجائی اس نے گردن جھکالی۔ اس کا چہرہ پہلے سے بھیا تک دکھائی دینے لگا تھا۔

ہیرے کا سارا غصہ اس ایک جملے نے شرمندگی میں بدل دیا۔ اس نے چاقو بند کر کے بڑے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ”کس

جماعت میں پڑھتے ہو؟“

”ایف اے میں....“

”اچھا کالج میں پڑھتے ہوا خوب!!“ ہیرا مسکرایا۔

”پڑھ کیا رہا ہوں...“ کوشش کر رہا ہوں۔“ وہ نوجوان بے ساختگی سے بولا۔ ”بوڑھی ماں ہے بے چاری... مجھے جج بنانے کے خواب دیکھتے اور لوگوں کے برتن مانجھتے اس نے دے کا روگ بھی پالا ہے اور آنکھوں کی پینائی بھی کھودی ہے اور میں ابھی ایف اے میں ہوں۔ اس کا خیال ہے میں بہت جلد جج بننے والا ہوں۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ میں آئندہ دس برسوں تک جج کیا، کچھ کمانے کے قابل بھی نہیں ہو سکوں گا تو شاید وہ پاگل ہو جائے۔ ویسے اب بھی وہ کچھ کچھ پاگل ہو چکی ہے مجھے ابھی سے جج صاحب کہتی ہے۔ چارری۔ مجھے تو اسی کی فکر ہے... خود تو فاقہ بھی برداشت کر لیتا ہوں اور سردی بھی! مگر میری ماں اس قابل نہیں کہ وہ ایک دن کا فاقہ برداشت کر سکے یا ایک رات کی سردی۔“

نوجوان خاموش ہوا تو دور دور تک ایک گہرا سناٹا تن گیا وہ کتا جو کچھ دیر پہلے مٹی بانی کے کوٹھے کے سامنے سے مٹی کرید رہا تھا اب دوسرے کتے سے مل کر رو رہا تھا۔ دونوں کتے دردناک آواز میں رو رہے تھے... مین کر رہے تھے۔ ہیرے نے دکھ بھری آہ بھری۔ اسے یاد آیا کہ وہ بھی سیدھے راستے کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا۔ یہ نوجوان بھی سیدھے راستے کا متلاشی ہے۔ یہ بندگلی میں آپہنچا ہے، میں اس گلی کی دیوار پھلانگ کر بھٹک رہا ہوں۔ اس کے آس پاس دیواریں ہیں اور میرے ارد گرد چٹیل میدان ہیں۔

بڑے اضطراب میں اس نے دو ایک بار پھنکار کر اس نوجوان سے کہا۔ ”تم جاسکتے ہو۔“

نوجوان چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اندھیرے میں جذب ہو گیا۔

اب کھبے کے نیچے دونوں کتے پھر زمین کرید رہے تھے۔

ہیرا کچھ دیر ٹہل کر اپنے اضطراب کو کم کرتا رہا۔ پھر اس نے مزار کی گلی میں جھانک کر چھی چھی کی آواز نکالی۔ نوکدار جوتوں اور تنگ پتلون والا وہ لڑکا باہر آیا تو ہیرے نے اس کا بازو تھام کر کہا... ”میں تمہیں گھر چھوڑ کر نہیں آ سکتا“ تم جوتوں کر کے خود ہی پہنچ جاؤ... ابھی ابھی تم سے قیمتی انسان یہاں سے گزرا ہے۔ وہ پیدل سردی میں ٹھٹھرتا گھر چلا گیا ہے... تم بھی سیدھے گھر چلے جاؤ اور دوبارہ الجھے ہوئے راستوں کی طرف لوٹو تو یہ سوچ لینا کہ پھر سیدھے گھر نہ جاسکو گے... جاؤ“

لڑکا گردن جھکا کر آہستہ آہستہ چلا گیا۔

اسی وقت گھٹنے نے تین بجائے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بہت تھک چکا ہے۔ تھکن کے اس احساس کے ساتھ ہی اسے سردی نے آدبو چا تو اسے چائے یا آگئی۔

اسے معلوم تھا کہ جمن خان کی حویلی کے شکستہ گیٹ سے اندر داخل ہوں تو راستہ کس گلی میں جاکتا ہے۔ بالکل اس گلی میں جہاں ڈیرے دار طوائفوں کے کوٹھے ہیں اور ان کوٹھوں کے نیچے ... ایک کبھی نہ بند ہونے والا محرم علی کا ہوٹل ہے۔ وہ سیدھا محرم علی کے ہوٹل میں چلا آیا۔ ہوٹل میں ابھی تک کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ وہ بھی کسبل کندھوں پر ڈال کر کرسی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

چائے کی پہلی چسکی کے ساتھ اسے خیال آیا کہ پیسہ تو اس کی جیب میں ہے نہیں۔ صرف دس کا ایک نوٹ ہے جو آستین میں سلا ہے اور جس کا یہاں نکالنا مناسب بھی نہیں۔ اسی ادھیڑ بن میں دس منٹ گزر گئے۔

پھر ایک نعرے کے ساتھ ”بلا کی والا“ اندر داخل ہوا ”ارے...“ اس نے کہا۔ ہیرے نے گردن اٹھا کر آنکھیں کھولیں۔ تو ”بلا کی والے“ کی سنہری مونچھوں سے مسکراہٹ کھیل رہی تھی وہ اتنی تیزی سے اٹھا کہ میز اٹلتے اٹلتے بچی۔ دونوں بغل گیر ہو کر یوں ملے کہ سب لوگوں نے مڑ مڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے ”بلا کی والے“ کے لیے چائے کا آرڈر دیا۔ تو ”بلا کی والے“ نے میز پر مکہ مارتے ہوئے ہوٹل کے چھوکرے سے کہا۔ ”من بے آڈر اپنا چلے گا۔ چائے بھی لاؤ اور کھانے کے لیے بھی۔“

پھر اس نے ہیرے سے کہا۔ ”کوئی سگریٹ ہے؟“ کش لینے سے پہلے ہی ”بلا کی والا“ جھوم گیا اس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر سلگانے سے پہلے سردیوار سے لگا کر منہ چھت کی طرف کر لیا اور لمبے لمبے کش لگا کر دواں چھوڑتے ہوئے سگریٹ کو بڑی احتیاط سے انگلیوں میں سیدھا پکڑ کر بولا۔ ”آج کھڑے کھڑے دو چار سودے مل گئے تھے۔“

”سودے...“ ہیرے نے تڑپ کر نگاہیں اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں گاڑ دیں۔ ”سودے سے تمہارا کیا تعلق؟“ ”یہ ناٹوٹ لٹ سکتا ہے بھلا؟“ ”بلا کی والا“ چپک کر بولا۔ ”مگر کیوں.... تم نے تو مدت ہوئی پیٹھ دکھا دی تھی۔“

”ہاں...“ ”بلا کی والا“ کہنے لگا۔ ”میں نے یوں بھی سوچا تھا۔“ اس نے لمبا سانس لے کر سگریٹ ہاتھ سے مسل دیا۔

”خیال تھا کہ اس بک بک سے چھوٹ جاؤں گا۔ دو بچوں کا باپ ہوں۔ جوان ہو کر کیا کہیں گے۔ ہمارا باپ دھاڑا ہے۔ اسی کارن میں نے علاقے میں آنا چھوڑ دیا تھا۔“

”مگر سودے کا چسکا بھی مزے کا ہوتا ہے۔“ ہیرا فورابولا۔

”ارے نہیں یار.. تو غلط سمجھا..“ ”بلا کی والے“ نے آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔

”پہلے سودا اٹھاتے تھے اور جیل دیل جاتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا سودا لوں یا نہ لوں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیل بھی جاؤں گا مار بھی کھاؤں گا۔ ورنہ پولیس کا ماہوار ادا کروں۔ انہیں اس بات سے سروکار نہیں کہ میں سودا لوں یا چھوڑ دوں، انہیں تو بس اپنا حصہ چاہیے اور جی حضوری اور خدمت گزاری الگ۔“

”تم نے انہیں بتایا نہیں کہ تم اب شریف آدمی بن چکے ہو۔“ ہیرا بولا۔

”جو ایک بار دس نمبر یا ہو جائے لوگ اس کی اولاد پر بھی شک کرتے ہیں۔ تم میری شرافت کا رونا رورہے ہو۔“

چھوکرے سے دوبارہ چائے منگوا کر دونوں پرچ میں انڈیل کر پینے لگے۔ اسی دوران ”بلا کی والا“ پھر بولا۔ ”آج پہلا دن تھا۔ بڑی گراؤنڈ کے پاس پل پر ڈھائی بجے تک آٹھ چھلڑ کا سودا ہوا۔“

”نکے یا سبزے؟“ ہیرے نے بے تابی سے پوچھا۔

”سبزے میاں... ایک سبز اتوا بھی گن نہیں رہا ان میں۔ وہ علاقے کے حوالدار کی پتی تھی معاملہ پہلے سے طے تھا۔ آدمی وہ بھی ایماندار ہے اور زبان اپنی بھی پتھر پر لکیر ہے۔“

گشت اس طرف آرہی تھی کہ وہ مجھے سائیکل پر آ کر اطلاع دے گیا۔ بلکہ پیچھے بٹھا کر گوروں کے قبرستان تک چھوڑ بھی آیا۔ ایسا سچا انسان کہ کیا کہوں۔ جب تک گشت گراؤنڈ کے پاس پل پر آئی ہوگی، میں نے دو سو روپے اور بنا لیے تھے۔ ایک چھلڑ تو حوالدار کا حق تھا ہی!... تو اپنی سنا... کچھ ملا آج؟“

”اول ہوں..“ ہیرے نے دھیمی آواز میں کہا۔

”کوئی سگریٹ بھی نہیں؟“

”نہیں!“

”وجہ؟“

”کسی کے پاس کچھ تھا ہی نہیں اور رہی بیڑیاں تو وہ زمانہ گیا جب لوگوں کے پاس شیفر اور پارکر کی بیڑیاں ہوتی تھیں۔ اب تو سکول کے چھوکرے سے ہیڈ ماسٹر تک ایک ہی آٹھ آنے والی پنسل ہوتی ہے۔“

”میرے سمجھ میں یہ بات نہیں آئی“ بلا کی والا حیرت سے بولا۔ ”آدمی نیک نیتی سے اڈے پر کھڑا ہوا اور خالی رہے؟“

”ہاں یار... تو نے بڑی دور کی بات کی۔ نیت میری ہی خراب تھی۔ کچھ دنوں سے میں سوچ رہا تھا کہ سودے بازی چھوڑ دوں اور کوئی سیدھا راستہ تلاش کروں۔ سو آج میرا ارادہ تھا کہ کوئی بڑا سودا ملے تو لے لوں، ورنہ یہ معلوم کروں کہ لوگ پیسے کیسے کماتے ہیں۔ شاید میرے لیے وہی راستہ بہتر ہو؟“

”پھر؟“ بلا کی والا جلدی سے بولا۔ ”معلوم ہوا راستہ؟“

راستے تو بہت سے ملے ہیں مگر جس پر بھی چلیں... اپنے ہی اڈے پر پہنچ جاتے ہیں۔“

بلا کی والا خوشگوار حیرت سے بولا ”میں نہیں سمجھا تمہاری بات“

”جتنے لوگ مجھے آج ملے تھے میں نے سب سے ان کے پیشے کے بارے میں پوچھا تھا۔ ان سب کا پیشہ اور میرا تمہارا پیشہ ایک

ہی ہے۔“

”وہ سب دھاڑیے تھے کیا؟“

”نہیں۔“ ہیرا ہنس کر بولا۔ ”یہ بات نہیں بلکہ کوئی خوراک میں زہر ملاتا ہے اور کوئی سیمنٹ میں دریا کی مٹی۔ کوئی ٹیکس بچاتا ہے تو

کوئی مذاق میں لوگوں کو لوٹتا ہے اور ہیرا منڈی آ کر لٹتا ہے۔ ایک ان میں ایسا بھی تھا جو صحیح معنوں میں بھوکا مر رہا تھا۔ سب سے زیادہ

ہمدردی مجھے اسی شخص سے ہوئی مگر میں اس کا پیشہ کیا بتاؤں وہ بھی میرے طرح رات کا مسافر تھا وہ کھبے کے نیچے رات بھر سردی میں

پڑھتا اور روگ خریدتا ہے۔ فاقوں کا علاج تو اس کے پاس ہے نہیں البتہ وہ اپنے جسم میں پلنے والی بیماریوں کا علاج پڑھ لکھ کر عمر کے

آخری حصہ میں ضرور کرا سکے گا۔ میرے لیے سب کے سب بیکار تھے۔ عجیب پیشہ باعزت ہے۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے کو نہیں

لوٹا۔“

ہیرے نے مسکرا کر بلا کی والا کی طرف دیکھا۔ ”بلا کی“ والا کی سنہری مونچھیں شرارت سے کانپ رہی تھیں۔ اس نے بات

بڑھائی۔ ”یار تو تو سیانا آدمی ہے جو ایک ہی رات میں سب کچھ سمجھ کر سیدھی راہ پر آ گیا۔ مجھے دیکھو... سال بھر بھٹک کر پہنچا ہوں

یہاں... ذرا ہاتھ ادھر کروناں!“

ہیرے نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو بلا کی والا نے مضبوطی سے تھام کر کہا۔ ”لے آج تو خالی رہا ہے نا... آدھے تو لے لے... اس نے مضبوطی سے تھامے ہوئے ہاتھ کی مٹھی میں کچھ نوٹ دے دیئے لمحے بھر کے تردد کے بعد ہیرے نے نوٹ لے لیے... پھر بولا... ”کل کیا پروگرام ہے!“

”کل کا پروگرام تو کل ہی بتا سکوں گا... بس اتنا یاد رکھو بڑا سودا ہے۔ مل کر اٹھائیں گے مولانا چاہا تو...!“

”اچھا“ ہیرا بولا ”مگر تم ذرا جلدی آجانا کام سے پہلے مجھے پیر باشا کے مزار پر موم بتیاں بھی جلانا ہیں۔“ ذرا رک کر اس نے بات بڑھائی۔ ”میں نے سیدھے راستے کی تلاش میں منت مانی ہوئی ہے!“

باہر کسی کتے سے سائیکل ٹکرا گیا تھا۔ کتے کی چیخ سن کر دونوں نے باہر دیکھا جہاں صبح کا دھندلا پھیل رہا تھا۔ اونچی منزلوں میں روشنیاں دم توڑ رہی تھیں اور رات بھر جاگنے والے کتے تھو تھنیاں اٹکائے کھولیوں کی طرف جا رہے تھے۔



دوسری کہانی

چاندنی میں نہائی ہوئی اس خنک رات کو گاؤں سے آدھی میل دور بیر یوں کے جھنڈ کے پاس چاچا عمرے کے ڈیرے پر پڑا ہوا کھاٹ سے میں ہونے کی وجہ سے گوبرکا ڈھیر معلوم ہوتا تھا۔ بیر یوں کے گہرے گہرے سائے اس کے اوپر سے ہوتے ہوئے جو ہڑ کے کنارے تک چلے گئے تھے۔ کھاٹ کے نیچے ڈبو گھسری بنا سوراہا تھا۔ اور اس سے کچھ دور بانگی چھپر تلے بندھی تھی اور چھپر کے بالکل سامنے چاچا عمر اتنا اپنی جھونپڑی میں بیٹھا حقہ گزرا رہا تھا۔

گھاس پھوس کی اس چھوٹی سی جھونپڑی کا چھپر سرکا ہوا تھا اور چاندنی کی ایک چھوٹی سی تہہ اندر بچھی ہوئی پرالی پر جمی تھی۔ چاچے نے اپنا موٹا کھیس ڈھیلا کر کے از سر نو کس کر لپینا اور چلم میں پڑی ہوئی آگ کریدتے ہوئے پھونک ماری۔ پھونک مارنے سے تھوڑی سی راکھ بھی اڑی اور چاندنی میں یوں تیرنے لگی جیسے دور کہیں برف گر رہی ہو۔

چاچا حقے کے بلکے بلکے کش لیتا رہا اور کچھ سوچتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد جب ڈبو بھونکتا ہوا کھاٹ کے نیچے سے نکل آیا بانگی ہنہنائی تو چاچا چونک کر کھڑا ہو گیا اور حقے کی نے گھما کر اسے بڑی احتیاط سے ایک کونے میں رکھنے کے بعد جھونپڑی کے دروازے پر آ گیا۔ دور جو ہڑ کے کنارے کنارے کوئی جوان گھوڑی پر جھک کر پوری رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ ٹاپوں کی آواز بڑی دھیمی تھی اور گھوڑی کے پیچھے اڑنے والی گرد و ہند معلوم ہو رہی تھی۔ بیر یوں کے قریب آ کر جب سوار نے رخ جھونپڑی کی طرف پھیرا تو چاچا دروازے سے ہٹ کر اندر آ گیا۔

سوار نے عین جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر گھوڑی روکی تو وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑی ہو گئی اور اس کا سایہ کانپتا ہوا جھونپڑی کے اندر تک آ گیا۔ گھوڑی سنبھالنے کے بعد سوار نے اتر کر اسے ایک درخت سے باندھ دیا اور خود کھانستا ہوا جھونپڑی میں آ گیا۔ چاچا اس وقت چار پائی پر بیٹھ کر حقے کی نے پر بوجھ ڈال چکا تھا۔

”جلدی ہی پلٹ آئے ہو سردارے!“ چاچے نے کش لیے بغیر سوار کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہوں“ پھپھسی آواز میں سردار بڑبڑایا۔ پھر پرالی کو اکٹھا کر کے اس کی ایک موٹی سی تہہ بنائی اور اس پر بیٹھ کر بولا۔

”جیجا مجھے چودھریوں کی بیٹھک میں مل گیا تھا۔“

”کوئی پنچائیت تھی کیا؟“ چاچے نے ابھی تک حقے کا کش نہیں لیا تھا۔

”نہیں“ سردار ایک بار پھر مری ہوئی آواز میں بولا ”جیراں اور تھیلے کی منگنی تھی۔“

”کون تھیلا؟“ نبی بخش ذیلدار کا؟“

”ہاں وہی۔“ سردار نے بڑی دھیمی آواز میں کہا اور کچھ دیر خاموش رہا۔ جب چاچا نے حقے کی نے اس کی طرف گھمائی تو اس نے ہلکا سا کش لے کر کہا۔ ”منگنی تو خیر کل ہوئی تھی، گڑ آج باننا گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی بات۔“

”کس بات کی سمجھ؟ کچھ کھول کر بیان کرنا۔“ چاچا تجسس بھری نگاہوں سے اس کی طرف مسلسل دیکھتا رہا، مگر سردار نے جواب دینے کی بجائے گردن پوری طرح جھکالی۔

چاچا جب دو تین کش لے چکا تو اسے احساس ہوا کہ اس کی بات کا جواب نہیں دیا گیا۔ وہ پہلے سے تند لہجے میں بولا۔

”منگنی تو جیراں اور تھیلے کی ہوئی ہے۔ تو کیوں گونگا بن رہا ہے؟ تجھے تو اس منگنی پر خوش ہونا چاہیے۔ کیا ہوا اگر اب تھیلے سے تمہاری دوستی نہیں رہی۔ تھا تو تیرا ہی یار، بچپن کا ساتھی، ویر، تو اس کی منگنی۔“

”کون کسی کا ویر ہے چاچا۔“ سردار بات کاٹ کر بولا۔ ”میں اس کا ویر ہوں نہ وہ میرا۔ پہلے اندر سے وہ میرا دشمن تھا۔ اب کھلے طور پر میں اس کے خون کا پیاسا ہوں۔“

چاچا کچھ دیر منتظر رہا کہ سردار اپنی بات مکمل کرے گا۔ مگر جب سردار کچھ نہ بولا تو چاچا تنگ آ کر کہنے لگا۔

”کچھ بول تو سہی۔ کیا آئیں بائیں شائیں کر رہا ہے۔ جیسا کہاں ہے اور وہ چیز؟“

سردار اگر دن گھما کر جھوپڑی سے باہر نکلنے لگا۔

چاند بیروں کے اوپر سے ہو کر جوہڑ کے کنارے آگے ہوئے کھجور کے درخت میں اٹک سا گیا تھا۔ اور چاندنی میں گاؤں، سمندر کے کنارے بنے ہوئے ریت کے گھر وندوں کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے چاند کو گھورتے ہوئے ہاتھ حقے کی نے کی طرف بڑھائے اور دو ایک کش لینے کے بعد بولا ”وہ بھی آ جائے گا۔ میں اسے راستے میں خود چھوڑ آیا ہوں۔ گوری تھکی ہوئی تھی نا، دونوں میں سے کوئی حقے کا کش لیتا تو سناٹا مجروح سا ہو جاتا۔ کتنی ہی دیر گم سم بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ سر کے ہوئے چہرے میں سے جھانکتی ہوئی چاندنی بھی آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگی۔ جب سردار آیا تھا تو جھوپڑی کے اندر گز بھی چاندنی پھیلی ہوگی۔ اب آدھی بھی نہ رہ گئی تھی۔ یکا یک ڈبو غراتا ہوا کسی جنگلی بلی کے پیچھے بھاگا تو دونوں باہر دیکھنے لگے۔ پھر سردار اچپ چاپ اٹھا اور دروازے تک آ کر ادھر

ادھر دیکھنے کے بعد واپس آ گیا اور بولا۔ ”جیجا آ رہا ہے شاید۔“

چاچے عمرے نے اپنی خوشحالی داڑھی کھجاتے ہوئے نگاہیں جھونپڑی سے باہر جمادیں۔

تھوڑی دیر بعد جیجا اندر آ گیا۔ اس نے سر پر کوئی موٹا کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ ایک ہاتھ میں کھونٹا تھا اور دوسرے میں کاغذ میں لپیٹی ہوئی کوئی چیز تھی۔ جب وہ اندر آ کر چار پائی پر بیٹھ گیا تو چاچے نے کہا۔ ”آ بھی جوان، کتنی دیر سے تیری ہی راہ دیکھ رہے ہیں، لائے ہونا۔“

”کیوں نہیں۔ آج تو سردارے کو بھی ٹوٹ ہے۔ کیوں ویرجی؟“ اس نے آخری جملہ سردارے کی طرف رخ پھیر کر کہا۔
سردار کچھ بھی نہ بولا۔ جچے نے کاغذ میں لپیٹی ہوئی چیز چاچے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ”اصلی کیکر کی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے کیکر کی جڑیں ڈال کر بوتل دبا لی تھی۔ میں تو بیویوں کا نہیں تم دونوں موج میلہ مٹاؤ۔“
”خیر یہ تو ہوا۔“ چاچے نے بوتل پرالی کی گٹھری میں اڑتے ہوئے کہا۔ ”اس کو کیا ہو گیا ہے۔ میری سمجھ میں تو نہیں آ رہی اس کی بات۔“

”بات تیری سمجھ میں آ بھی نہیں سکتی۔“ جیجا حقے کا پہلا کش لے کر بولا۔ ”پھر بھی سن لے۔ باتیں تو اس جوان سے تو ہر روز پھامی کی سنتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی کب کی بیاہی جا چکی ہے۔ مگر نئی کہانی تو تم نے سنی ہے نہیں۔ دیکھو نا۔“ چار پائی کے سامنے بیٹھ کر اس نے چاچا کو پوری طرح متوجہ کر لیا۔ ”اب اگر ہم سے نہ چھپاتا۔ تو یہ رشتہ ہاتھ سے جاسکتا تھا؟“
”رشتے کی بات نہیں“ پہلی بات سردار اتنی اونچی آواز میں بولا۔ ”بات تو اس ضد کی ہے جو میرے اور تھیلے کے درمیان چلی آ رہی ہے۔ کل تک تھملا تھا۔ آج شہر سے لوٹا ہے تو محمد طفیل ہو گیا ہے۔“

”کس بات کی ضد؟“ چاچے نے سردارے کو سانس لینے کی مہلت دیئے بغیر پوچھا۔

”جیراں کو بیاہ لانے کی ضد اور کون سی؟ میں ضدی تو نہیں ہوں، دعویٰ بھی اس لیے کر بیٹھا کہ جیراں مجھے دل و جان سے چاہتی ہے۔ میں نے اس سے کبھی بات نہیں کی تو کیا ہوا۔ مائی طالعاں مجھے صاف بتا گئی تھی کہ جیراں تو اب تیرے ہی گن گاتی ہے۔ ورنہ ضد کس بات کی؟“

”پھر“ چاچا تجسس بھری آواز میں بولا۔

”پھر تمہیں کیا بتاؤں۔ میں بھی تو ایسی ہی لڑکی چاہتا تھا جو صرف مجھے چاہے میری ہو کر رہے۔ ورنہ گاؤں میں لڑکیوں کا کال تو

نہیں ہے۔ چودھری کے گھرمائی طالعاں کے ذریعے بات چیت ہو رہی تھی۔ جانے یہ تھیلا شہر سے ایک دم کیسے آج پکا۔ خبر ہی نہیں سنی اس کے آنے کی۔ جچے کی طرف گیا ہوں تو راستے میں بڑی حویلی کے پاس چودھری کی بیٹھک میں ٹھنڈے مذاق کی باتیں سن کر معلوم کیا تو شرم سے پانی پانی ہو گیا۔“

”تو ہوا کیا۔“ جیجا بچ میں بول پڑا۔ ”تو تو یوں کڑھ رہا ہے جیسے تیری رستی بستی بیوی کو بھگا کر لے گیا ہو تھیلا۔ تو آج بول آدھی زبان سے تھیلے کی بہن بیاہ دوں تجھ سے۔ دس گھماؤں زمین ک اکیلا مالک ہے تو روتا کیوں ہے؟“

”تو بت نہیں سمجھا جچے۔ خواہ مخواہ بچ میں بول پڑتا ہے۔ سن تیرے مولانے چہ تو حیرں کو بیاہ کر نہ لے جاسکے گا تھیلا بھی۔ اور گر جیراں کی ڈولی لے گیا تو سی دن تمہیں بھی تھیلے کے جنازے کو کندھا دینا ہوگا۔ ارے پاگل! جونوں کی بھری محفل میں قول دے کر ی تھا کیا منہ لے کر جٹوں کا سب کے سامنے؟“

سردارے نے حقے کی نے اپنی طرف کھینچی، منہ بال کو ہاتھ میں لیا اور مٹھی کے دھانے پر ہونٹ جما کر کش لینے لگا۔

کچھ دیر تینوں خاموش بیٹھے رہے پھر سردار ا فیصلہ کن انداز میں کھڑا ہو کر بول ”ذرا ذرا بائگی لے جا رہا ہے ہوں۔ گوری صبح سے بہت چلی ہے تھکی ہوگی۔“

”بائگی سو بار لے جاتو۔ پر اس وقت جا کدھر رہا ہے۔ اور پھر اس کا کیا بنے گا؟ چاچے نے بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آخری جملہ کہا۔

”میر پور تک کتنی دور ہے۔ میر پور زیادہ سے زیادہ دوسرے ہوگا۔“ اس نے جھونپڑی سے نکلے ہوئے کہا اور بائگی کھول کر اس کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

فضا میں بائگی کی ٹاپیں ابھریں پھر آہستہ آہستہ معدوم ہو گئیں۔

رات کے تیسرے پہر جب سردار الوٹ کر ڈیرے پہنچا تو چاند مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے کان اور منہ کپڑے میں اچھی طرح سے لپیٹ رکھے تھے۔ یہ بائگی کا تیکھا پن تھا کہ وہ اس قدر جلد الوٹ آیا تھا۔

جب وہ جھونپڑی کے سامنے پہنچا تو بائگی قدم قدم چل رہی تھی۔ اس بار نہ گوری ہنہنائی نہ ڈوب غرایا۔ بس گہرا سناٹا چھایا رہا۔

بڑی پھرتی سے اس نے بائگی سے اتر کر اسے کھونٹے سے باندھا اور جھونپڑی میں چلا آیا۔

جیجا اور چاچا پرالی پر آڑے ترچھے سو بیٹھے۔ بوتل پر ابھی تک چاچے کا ہاتھ تھا۔

سردارے نے گھبرا کر جچے کی پنڈلی پر آہستہ سے ٹھوکر ماری۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں شراب پی کر نشے میں پڑے ہیں مگر جب وہ چاچا پر جھکا تو اس کیساتھ کے نیچے بھری ہوئی بوتل دیکھ کر اسے کچھ تسلی ہوئی۔

اس نے دونوں کو باری باری جھنجھوڑ کر جگایا۔ دونوں کچھ دیر اپنی اپنی آنکھیں ملتے رہے پھر جب ان کی آنکھوں میں روشنی اور تجسس ایک ساتھ اٹھ اٹھے تو وہ سردارے کی طرف گہری نظروں سے دیکھنے لگے۔ سردار نے آہستہ آہستہ کھیس کی بکل کھولی اور دونوں کی بندوق نکال کر دونوں کے سامنے رکھ کر مسکرائے لگا۔

”یہ کیا ہے؟“ چاچے نے سوئی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”تھیلے کی تقدیر“ سردار ا ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔

چاچا پہلیچو چپ چاپ سردارے کی طرف گھورتا رہا۔ پھر اٹھ کر چار پائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”تھیلے کی تقدیر کے ساتھ کھیلتے ہوئے تو اپنی جوانی کیساتھ بھی کھیل رہا ہے دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے سے عمر لمبی نہیں چھوٹی ہوتی ہے اور پھر دس گھماؤں زمین بچ کر اگر تم بچ بھی گئے۔ تو کیا یہ زندگی زندگی ہوگی؟“

”تو کیا جانے چاچا۔“ سردار بولا ”چودھری کی لڑکی سے منگنی کرا کے اس نے میرے جسم میں انگارے بھر دیے ہیں۔ اپنے سر میں سات چولہوں کی راکھ اڑتی ہو محسوس کرتا ہوں۔ مرد کے لیے یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔ ایک بار تو ضامن علی پنواری کے بھرے ڈیرے پر ہم نے ایک دوسرے کو بھٹک مار کر مقابلے میں آنے کی دعوت دی تھی۔ اصل بات تو جیراں تھی۔ مرنے مارنے کی بات ہوتی تو بھری محفل میں اس طرح نہ لوٹا۔ لاش ہی آتی۔ اب ہر محفل میں اس کی شنی سن کر شرم کے مارے گردن جھکا لینے سے یہ بہتر نہیں کہ ہم میں سے ایک نہ رہے۔ وہ تو خیر سوچتا ہی سوچے گا۔ میں کیوں نہ اس کا خون پی کر کلیجہ ٹھنڈا کر لوں؟ چودھری بھی یاد کرے گا۔“ سردارے نے جچے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”مائی طالعاں سے تھوڑی سی بات کر کے بھی رات بھر میں بدل گیا۔ اب دیکھوں گا۔ کیسے گھر بستا ہے تھیلا کا؟“

سردار ا خاموش ہوا تو چاچے نے کھنکار کر بولنے کے لیے زمین ہموار کی۔ مگر سردارے نے اس کی کھانسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً کہا۔

”چاچا! زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے اسے اگر میرے ہاتھ سے اور مجھے پھانسی سے مرنا ہے تو کون روک سکتا ہے ہم دونوں کو؟ ویسے تو فکر نہ کر۔ سردار ا کوئی کچی گولیاں نہیں کھیا ہوا۔ انتظام پورا ہے تیری دعا سے۔ سنے گا تو سردھنے گا۔“ سردارے نے

زمین سے بندوق اٹھا کر چار پائی کے پائے کے ساتھ کھڑی کر دی۔ ”یہ بندوق میرا پورا جا کر دلے ماچھی سے لایا ہوں۔ بغیر لائسنس کی ہے۔ فائر تو ہوگا اس بندوق سے اور پھر مقدمہ چلے گا نا۔ سن رہا ہے نا میری بات؟ غور سے سن، مقدمے میں اپنی بندوق پیش کروں گا۔ سمجھا؟“

”کون سی اپنی؟“ چاچا بے ساختہ بولا۔ ”جس کی نالی نیچے سے پھٹی ہوئی ہے۔“

”اس کی تو ہر کل خراب ہے، وہی نا؟“ چاچے کی بات سے متصل جچے نے کہا۔

”ہاں، وہی۔“ مگر تم کیا جانو اس چکر کو؟ چھ سال سے اس ناکارہ بندوق کا ٹکس دے رہا ہوں۔ بات بتانے کی نہیں مگر یاروں کی منڈلی میں جانے کیوں رازا چھل اچھل کر حلق کی طرف آنے لگتے ہیں تو بات اتنی ہے کہ اس رنگ آلود بندوق کا لائسنس بنوایا تھا کہ دو برتن لکرا جائیں اور میرے مقابلے کا برتن ٹوٹ جائے تو بیچنے کے لیے ایک راستہ باقی رہے یعنی فائر تو کروں گا دلے ماچھی کی بندوق سے اور عدالت میں یہ پیش ہوگی۔ عدالت اتنی پاگل تو ہے نہیں کہ اس کڑکھائی بندوق کو دیکھ مجھے پھانسی دے دے ہوں۔“

سردار اخاموش ہوا تو کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ چاند جھونپڑی کے اوپر سے ہو کر دوسری طرف اس حد تک نکل گیا تھا کہ جھونپڑی کا سایہ چھپر تلے بندھی باگی کے قدموں کو چھونے لگا تھا۔ سناٹا اتنا گہرا تھا کہ گاؤں میں اذان دینے والے مرغ کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر تینوں یوں چپ بیٹھے رہے کہ جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر چاچا اپنے لمبے لمبے سفید بالوں کی ایک لٹ شہادت کی انگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے بولا ”ساری بات تو جوانی کی ہے، جوانی جس کسی پر آتی ہے، کچھ دے لے کر گئی ہے۔ جب میں جوان تھا، تو تو شاید دودھ پیتا بچہ ہوگا۔ عجیب سرور اور نشہ سار ہوتا تھا ہر وقت۔ منڈلی بیٹھتی تھی تو رات بھر دوسروں سے لڑنے کا پروگرام بنتا تھا خون تھا نارگوں میں، خواہ خواہ لڑنے کو جی چاہتا تھا کبھی کبھی جب کوئی بھی لڑنے پر آمادہ ہوتا تو جی کرتا اونچے اونچے درختوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اکھیر دوں۔“ چاچا منہ ہال کو ہاتھ سے چھوڑ کر پرالی کوٹنے پر لپٹنے لگا۔ ”تم جانو جب جوانی اتنی بے قابو ہو تو اس کی لگام ضروری ہے۔ لگام ایسی ہو کہ دل خود قبول کرے۔ میرے اسم نہ زور جوانی کی لگام مجھے نوری کے ہاتھ میں نظر آئی پہلے دن تو میں نے اسے یوں ہی نظر انداز کر دیا۔ مگر جب کچھ دنوں بعد اس نیچھے دیک کر ناک چڑھائی اور منہ پھیرا تو یہ لگام ٹوٹی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے دل کو تسلی دی کہ مذاق کر رہی ہے۔ مگر شاید یہ مذاق نہ تھا اس کی ہر حرکت سے پتا چلتا تھا کہ وہ مجھ سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی۔ کیا کیا جتن نہ کیے ہوں گے میں نے۔ ملل کی قمیص پہن کر پوس ماگھ کے مہینوں میں پھرا ہوں۔ پھرے چوپال میں بیٹی پکڑنے کے بہانے سے نور بخش دھوبی کے بیٹے کا انگوٹھا توڑ دیا اور پھر ایک بھاگتے چور کے پیچھے چھری لے کر

اس وقت بھاگا جب سارا گاؤں منہ دیکھ رہا تھا چور کے پاس دیسی پستول تھا مگر ان سب باتوں کا مطلب نوری کیدل کو پھیرنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ نوری کسی طرح اس اندھی جوانی کی لگام بن کر میرے گلے سے آگے۔ مگر اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور پھر اسی طرح بالکل تمہاری طرح میں بھی نفرت کے شعلوں میں جل کر محبت جیتنے نکلا مگر ہار گیا۔

تم نے دے لے ماچھی سے بندوق مانگی ہے اور اپنے بچاؤ کے لیے منصوبے بنالیے ہیں۔ مگر میں اکیلا بغیر کچھ سوچے سمجھے اس آگ میں کود پڑا رات کو اپنے ڈیرے سے گاؤں واپس آ رہا تھا ان دنوں میرا ڈیرا گاؤں کی پرلی جانب ہوتا تھا۔ جہاں آج کل جمالے کے کھیت ہیں۔ خیر پرانی چکی کے موڑ پر مجھے نوری ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ اس وقت اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ جی میں آیا چیخیں مارتی ہوئی کو اٹھا کر بھاگ جاؤں سیدھا ڈیرے۔ مگر میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ مجھے تو وہ اس وقت کانچ کی بنی ہوئی لگتی تھی اس لیے میں نے ہاتھوں میں نرمی پیدا کر کے اس کی طرف بڑھایا۔ مگر آہٹ پا کر وہ یوں چونکی جیسے گولی چلی ہو اور پھر خوف سے وحشی ہرنی کی طرح اتنی تیز بھاگی کہ کھال بھی نہ پھلانگ سکی اور بری طرح گر پڑی اس نے ایک بار اٹھنے کی کوشش کی مگر یوں بانپ کر رہ گئی جیسے پاؤں میں من من لو باندا ہوا ہو۔ میں اپنی قسمت پر مسکرانے ہی والا تھا کہ جیرا ایک تیز ٹیکھی گھوڑی کو بھگاتا ہوا چکی کے موڑ سے یوں آ پہنچا جیسے پہلے سے چھپا بیٹھا ہو۔ میرے قریب آ کر اس نے صرف میری طرف گھور کر دیکھا اور جلدی سے گھوڑی سے اتر کر نوری کو اٹھانے لگا۔ میری طرف اس لیے نہ بڑھا ہوگا کہ میرے ہاتھ میں چم چم کرتی چھوٹی تھی نوری اٹھی اور اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے تو اس وقت اپنے کپڑے بھی آگ کے بنے ہوئے لگے۔ ہتھیلیوں پر پسینہ آ گیا۔ کان شاخیں شاخیں کرنے لگے اور بات کی تہہ تک پہنچنے میں مجھے ذرا بھی دیر نہ لگی۔ پہلے ہی مجھے جیرے پر شک تھا کہ وہ ہر روز شام کے بعد گھوڑی پر بیٹھ کر اکیلا ڈیرے کی طرف کیوں جاتا ہے۔ جیرا ایک منٹ تک چپ چاپ مجھے گھورتا رہا اور پھر اوپر تلے دو تین موٹی موٹی گالیاں دے کر غصے سے ہانپنے لگا تھا تو وہ بھی اونٹ جتنا جوانا ورم میں بھی نہ تھا۔ چھوٹی پاس نہ بھی ہوتی تو مقابلہ کئے بغیر نہ جاتا۔ مگر میں نے گالیوں کا جواب گالیوں سے دینے کی بجائے کہا۔ ”کیوں حرام موت مرتا ہے؟ گھوڑی پر بیٹھ اور گاؤں بھاگ جاوہ میری بات پر اور بھی پھر گیا اور زمین سے ایک بڑا سا ڈھیلا اٹھا کر پوری طاقت سے میرے سر پر دے مارا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش تو بہت کی۔ مگر مجھے ڈھیلا آن ہی لگا۔ سر پر لگتے ہی دو تین چکر آئے۔ غصے میں بھرے ناگ کی طرح میں نے چمکتی ہوئی چھوٹی سے جیرے پر بھرپور وار کیا۔ مگر وہ اس کا کندھا چھوتی ہوئی نوری کے سینے میں اتر گئی میں نوری کو نہیں مارنا چاہتا تھا لیکن جب میں نے چھری اس کے سینے سے باہر کھینچی اور خون کا فوارہ بہہ نکلا تو اس وقت مجھے اس کے مرنے کا ذرہ بھر بھی افسوس نہ ہوا۔ بلکہ میں نے اس پر دوسرا وار کر کے اسے جلدی ٹھنڈا

کر دیا جیرا زخمی کندھے پر ہاتھ رکھے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں نے اس پر دوسرا وار کرنا مناسب نہ سمجھا، خبر نہیں کیوں۔ مگر مجھے یاد ہے کہ میں نے ڈر کر نہیں بلکہ اپنی مرضی سے اس پر دوسرا وار نہیں کیا تھا۔“

”پھر؟“ چاچا ایک لحظہ کے لیے چپ ہوا تو جیجا اور سردار اکل دار کھلونوں کی طرح پھڑک کر بول پڑے۔

”پھر کیا؟“ جیرے کی گھوڑی سامنے کھڑی تھی میں اس کی نگلی پیٹھ پر بیٹھ کر چک نمبر ۸۰ بھاگ گیا۔ مگر جانے کیسے صبح ہونے سے تھوڑی دیر پہلے مجھے گرفتار کر لیا گیا پانچ چھ روز میں وہ وہ خبریں اڑی ہیں گاؤں میں کہ پہلے ان کی بھینک بھی نہ پڑی تھی۔ سارا گاؤں کہتا پھرتا تھا کہ نوری ہر روز عمرے کو ملنے جایا کرتی تھی اور جب دونوں کو جیرے نے دیکھ لیا تو دونوں جوانوں کی ٹھن گئی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ نوری کا قاتل جیرا ہے جب نمبر دار کے ساتھ اماں جیناں مجھے حوالات میں ملنے آئی تو اس نے مجھے ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ میں تلملا کر رہ گیا وہ کہہ رہی تھی کہ نوری پرانی چکی کے موڑ پر تمہاری راہ دیکھنے جایا کرتی تھی۔ اور جیرا اس پر مرتا تھا۔ ورنہ اس نے تو کبھی جیرے سے بات بھی نہ کی تھی۔ میں نے سب کی باتیں کان لگا کر سنیں اور خاموش رہا۔ حتیٰ کہ میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہا نہ نوری کے خلاف چپ چاپ جیل چلا گیا معلوم نہیں میں نے ایسا کیوں کیا۔ جانے وہ کون سی شے تھی جو اندر ہی اندر مجھے جیل جانے پر اکسارہی تھی سات سال جیل میں سزا ہوں پر میں نوری کو نہ بھول سکا۔ اتنی لمبی قید اور اس کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد اور پھر آج چوبیس برس کے بعد بھی وہ مجھے یاد آ رہی ہے۔ وہی معصوم کانچ کی بنی ہوئی نوری جو پرانی چکی کے موڑ پر چھپ کر مجھے دیکھا کرتی تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نے کوئی ایسا گناہ کیا ہے جس کا داغ پھانسی کی سزا پا کر بھی نہیں دھو سکتا میں نے اکثر اسے خواب میں دیکھا ہے وہ محبت کرتی تھی نا۔ مجھ سے نہ سہی جیرے سے ہی سہی کسی ایک کے لیے تو اس کے دل میں محبت تھی مجھے بعض اوقات ان خیالوں سے اس قدر وحشت ہوتی ہے کہ دل کا زخم ہرا ہو جاتا ہے۔ جیسے میں نے گلال جیسے چہرے والی معصوم نوری کو نہیں بلکہ زہر میں بجھی ہوئی تلوار اپنے کلیجے میں بھونک دی ہو۔ دن کو رات کو سوتے جاگتے اس نے میرا دامن کھینچا ہے۔ آدھی آدھی رات کو اکثر مجھے جگا جگا کر لایا ہے یہ کیسی عورت تھی میں نہیں سمجھ سکا۔ میں نے اسے قتل بھی کیا تھا میں اس کی یاد میں تڑپا بھی ہوں میری روح کو کسی وقت بھی چین نہیں ملا۔“

”جیرے کا کیا بنا؟“ جیجا سوئی سوئی آواز میں بولا۔

”میرے جیل جانے سے واپس آنے تک وہ یہ گاؤں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔“ چاچا مونے ٹکھیں کے کونے سے اپنی نم آلود آنکھوں کو خشک کرتے ہوئے جھونپڑی کا چھپر سر کا کر باہر نکل گیا تو صبح کا ہلکا ہلکا نور اندر آنے لگا جیجا اور سردار اچپ چاپ جہاں بیٹھے تھے وہیں

لیٹ گئے۔ دونوں نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ صرف ایک بار بچے نے اٹھ کر چھپر کو جھونپڑی کے دھانے پر جمادیا اور پھر لیٹ گیا۔ پورنماش کی رات سے لے کر چاند کی بیس تک گاؤں بھر میں وہ ڈھولک بجی ہے کہ کچی کوئل کنواریوں کے دل بھی شادی بیاہ کے تصورات میں ڈوب ڈوب گئے۔ کسی نے لال چوڑا اچھکا کر ہونٹوں پر اجلی مسکراہٹ سجائی ہے تو کسی نے سرخ سرخ آنجل کمرے کے کرد لپیٹ کر پورے آنگن میں پاؤں تھرکائے ہیں۔ جیراں چودھری کی بیٹی نہ ہوتی تو مرغی کی طرح ڈربے میں بند کر کے سسرال پہنچادی جاتی۔ مگر وہ تو چودھری جلال کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی قریب کیا آگئی تھی سر پر پہاڑ لگ رہا تھا سب کو۔ سلامت کی دوکان کی کناری اور کرن دو دن میں پھیل کر چھوٹی بچیوں کے دوپٹوں سے الہڑ جوانیوں کے لہنگوں تک جا پہنچی تھی شادی سے دو دن پہلے جب رات کو بڑے پرانے درخت کے نیچے بچھی ہوئی بے شمار چار پائیوں پر بیٹھے جیراں اور تھیلے کا نکاح ہو گیا اور چھوہاروں کی بارش شروع ہو گئی تو سردار اندھیرے سایوں میں سے ہوتا ہوا چاچا عمرے کے ڈیرے پر آ پہنچا۔ اس وقت چوں کہ وہ نکاح ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا تھا اس لیے اس کے کان سرخ اور آنکھیں وحشیوں جیسی ہو رہی تھی۔ چاچا کلف لگی سفید پگڑی کو سر پر جما چکا تو اسی طرح بندھی پگڑی کو اتار کر کھونٹی پر لٹکا کر بولا۔ ”نکاح ہو گیا خیر سے تیری جیراں کا؟“

سردار اس وقت یہ بات سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے عجیب بری بری آنکھوں سے چاچے عمرے کی طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا۔

جب چاچا عمرے نے دوبارہ بغیر کچھ کہے اس کا کندھا ہلایا تو وہ تقریباً روتے ہوئے بولا ”نکاح ہیہو ا ہے ڈولی تو نہیں اٹھ گئی اور سردار امر گیا ہے کیا؟“ پھر جب چاچے نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ خود ہی چاچے کی طرف بڑی تمکنت سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”برات پرسوں جا رہی ہے۔ چراغ جلتے ہی چل پڑے گی۔ دے ماچھی سے ملی مانگ لوں گا۔ وہ ذرا تیکھی گھوڑی ہے۔ بانگی پر جیبا ہو گا۔ اور اگر دلا رضامند ہو گیا تو اسے اپنی گوری پر بٹھا کر ساتھ لے لوں گا۔ ان دونوں کو ساتھ لے جانے سے فائدہ یہ ہے کہ یہ میرے آگے آگے رہیں گے اور دوسرے گھوڑیوں والے جوانوں کو تھیلے کے قریب نہ آنے دیں گے۔“

سردار اس بات کے انتظار میں چپ ہو کر چاچے کی طرف دیکھنے لگا۔ کہ شاید وہ کوئی مشورہ دے گا مگر جب چاچا سردارے کی طرف پڑ پڑ دیکھنے لگا تو سردارے نے خود ہی موضوع بدل دیا اور بولا ”سورما ہوتا تو شادی سے پہلے ہی ایک بار مل جاتا۔ لیکن وہ تو اندر سے نکلنے ہی کو رہا۔ رات رات بھر گلیوں میں چھپ کر بیٹھا ہوں کہ مل جائے“ مگر شاید میرے ارادوں کو پھانپ ہے وہ۔ کیوں

”چاچا؟“

چاچا ابھی جواب دینے کے لیے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ جیجا بھاگتا ہوا اس زور سے سامنے کی کھری پھلانگ آیا کہ بانگی ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ سانس برابر کیے بغیر وہ سردارے کی طرف منہ کر کے بولا۔

”سردارے....! تھیلا۔“

”کہاں؟“ چاچا اور سردار ایک ساتھ بولے۔

”نکاح کے بعد جب سب لوگ گھروں کو جا رہے تھے۔ تو وہ اپنے ساتھیوں سے گھنٹے بھر کی چھٹی لے کر سیدھا کھیتوں کی طرف گیا تھا۔“

”سچ؟“ سردار ایک دم کھڑا ہو کر بولا۔

”میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

سردارے نے مزید کچھ کہنے کی بجائے پرانی ادھر ادھر ہٹائی بندوق نکال کر سامنے کھڑی کر دی۔ پھر ڈب میں دو تین کارتوس رکھے اور جھونپڑی سے باہر آ کر چچے سے کہنے لگا۔ ”تو بھی میرے ساتھ آنا بانگی پر تو بیٹھ جا۔ میرے پاس تو دلے کی گھوڑی ہے۔ گوری کو تو پورا گاؤں جانتا ہے پہچان لی جائے گی ہوں!“

چاچا چپ چاپ دونوں کو دیکھتا رہا اس کی خاموشی کو رضامندی سمجھ کر دونوں چھپرتے آئے اور گھوڑیاں کھول کر جوہڑ کے کنارے کنارے کھیتوں کی طرف نکل گئے۔

پہلے آموں کا جھنڈ آیا، پھر میراں بخش کا باغ اور اس کے بعد جمالے کے کھیت شروع ہو گئے۔ جمالے کے کھیتوں میں جب وہ میراٹیوں کی جھونپڑیوں کے پاس پہنچے تو طرح طرح کے سوکھے سڑے کتے تھو تھنیاں اٹھا اٹھا کر بھونکنے لگے مگر وہ ان کی پروا کیے بغیر گھوڑیاں بھگاتے ہوئے جمالے کے کھیتوں کی حدود پہنچ گئے۔

جیجا دو گز پیچھے آ رہا تھا جب وہ کھلے راستے پر آ گئے اور چچے نے بانگی سردارے کے برابر کر دی تو سردارے نے امید کی لو کو سنبھالا دینے کے لیے پوچھا۔

”وہی تھا نا؟ دھوکا تو نہیں کھا گئے؟“

”واہیار“ جیجا فوراً بولا ”تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ وہی تھا“ میں نے تو ایک عمر اس کے ساتھ کھیل کر گزاری ہے۔“

حاجی گل محمد کے ڈیرے تک دونوں خاموش رہے۔ اس وقت دونوں گھوڑیاں قدم قدم چل رہی تھیں۔

جب وہ ڈیرے کی چار دیواری کے پاس سے گزرنے لگے تو جیبا ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوئی سفید گھوڑی کو دیکھ کر چیخ اٹھا۔
”لو دیکھو بالکل سفید ہے نا اسی کی ہے۔“

سردار نے سانس روک کر لگا کھینچ لی اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔ ”تو بانگی کو پیچھے ہی لے جا۔ جب بندوق چلنے کی آواز آئے تم میرا بخش کے کھیتوں میں سے ہو کر نکل جانا چاہے کے ڈیرے پر خیال رہے بانگی کو کوئی پہچان نہ سکے۔“ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”اول تو بندوق کی آواز سنے گا کون؟“ اور اگر کسی نے سن بھی لی تو لوگوں کے آنے تک میں میر پور پہنچ جاؤں گا اور دے لے ماچھی کو گھوڑی اور بندوق سوئپ کر خود بھی وہیں رہ جاؤں گا۔“

”اچھا“ جیبا جیسی آواز میں بولا ”بانگی کو کتنا پیچھے لے جاؤں؟“

”میرا بخش کے کھیتوں کے موڑ پر“ سردار نے لمبی سانس کھینچ کر بندوق میں کارتوس بھرے اور بولا۔ ”جواب پلٹ جا۔ بانگی کو قدم قدم لے جانا۔“

جیبا آہستہ آہستہ گھوڑی موڑ کر واپس چلا گیا۔

سردار ایک لمحے تک گھوڑی پر ہی بیٹھا رہا۔ پھر اس نے بڑی احتیاط سے قدم نیچے اتارا اور بلی کو ایک درخت کے نیچے گہرے سایوں میں باندھ دیا اور پنجوں کے بل چلتا ہوا حاجی گل محمد کے اجڑے ہوئے سنسان ڈیرے کی سمت چلنے لگا۔ ڈیرا کیا تھا چار دیواری سی تھی۔ اس کے ساتھ ایک شکستہ سا کمرہ تھا۔ چار دیواری سے باہر آموں کے گہرے گھنے درخت تھے۔ وہ درختوں کے تنوں کے ساتھ لگ لگ کر دیوار تک پہنچا۔ یہاں تک کہ آخری کونے میں کھری اور کچی اینٹوں کا چبوترہ آ گئے۔ چبوترے پر چڑھ کر اس نے آہستہ آہستہ سر کو دیوار سے اونچا کیا اور ایک لمحے تک اندھیرے میں سانس روکے کھڑا رہا۔ اس نے تھیلے کو دیکھ لیا تھا مگر اسے دیکھ کر مطمئن ہونے کی بجائے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ اپنے پاؤں برف میں دھنسے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ مگر اب سے سردی کا مطلق احساس نہیں رہا تھا۔ جسم پر چیونٹیاں رہتی ہوئی محسوس ہونے پر وہ چبوترے سے نیچے اتر آیا۔ اس کے ذہن میں ایک لفظ ابھرا تھا۔ پھر ایک اور لفظ جیراں۔ یہ دونوں الفاظ ابھرے ناچے اور گنڈھ ہو گئے؟

وہ یہاں صرف تھیلے کی تلاش میں آیا تھا۔ تھیلے کے ساتھ رات کے گہرے سناٹوں میں لپٹی ہوئی جیراں کو دیکھ کر اسے ایک بار تو یقین ہی نہ آیا۔ دوسری بار پھر اس نے ہمت کر کے چبوترے کی طرف قدم بڑھایا تو اس میں اوپر چڑھنے کی سکت نہ تھی وہ کچھ دیر

چپ چاپ زمین پر ہی کھڑا رہا۔ بندوق کو بائیں ہاتھ میں تھام کر چبوترے پر قدم رکھا۔ اور بغیر کچھ سوچے اس کے اوپر چڑھ گیا اور کسی خاص وقت کا انتظار کئے بغیر بندوق اٹھا کر سایوں کی شست لی۔

اسی اثنا میں جیراں تھیلے کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ”کتنے بے صبر ہوتے دو دن بھی انتظار نہ کر سکے۔ پرسوں تو میں تمہارے پاس چلی ہی آتی۔“

تھیلا اس کے جواب میں کھلکھلا کر ہنسا تو سردار نے بندوق نیچے کر لی اور ان کی باتیں سننے لگا۔

تھیلے نے جیراں کے قریب ہو کر اس کے کانوں میں دیکتے ہوئے جھمکوں کو آہستہ سے کھینچا اور بولا ”چھپ چھپ کر ملنے میں جو مزہ ہے وہ تو تمہیں ہمیشہ کے لیے پالینے میں بھی نہیں۔“ جیراں کچھ نہ بولی۔

”بول جس وقت تو گھر سے نکلی ہوگی۔“ تھیلا پھر بولا ”کتنا مزہ آیا ہوگا؟“

”خاک!“ جیراں گلگتی ہوئی کہنے لگی۔ ”فیروزاں اور چاچی کے پاؤں کو مہندی لگا کر یوں ہی بہانے سے نکلی ہوں۔ ورنہ وہ میرے ساتھ آتیں۔ اب بھی جیناں ساتھ آئی نے۔ پر انہیں کیا پتا کہ جیناں میری پکی سہیلی ہے۔“ جیراں مسکرائی بڑی اچھی ہے بیچاری سب عورتوں کے پاؤں میں مہندی لگا کر باہر نکلنے کی ترکیب بھی اسی نے بتائی تھی۔“

”مگر تم تو اکیلی آئی تھیں۔“ تھیلا گھبرا کر بولا۔

”اکیلی کیسے آ سکتی تھی جن جن جی؟ جیناں کے ساتھ آئی ہوں.... جیناں کے ساتھ۔ چاہے نورے کے کنویں پر جو باڑ ہے نا۔ وہاں کھڑا کر آئی ہوں اسے۔ بس تو جلدی بول کیا کہنا ہے۔“

”کہنا کیا تھا“ تھیلا اس کے بالوں کو چھوتے ہوئے بولا۔ ”بس نکاح کی مبارک دینی تھی۔“

”یوں کہو۔ خواہ مخواہ تنگ کیا ہے مجھے۔“

”اری پگلی تو نہیں جانتی۔ برسوں کی محبت اور انتظار کے بعد آج تمہیں پایا ہے۔ ساری محنت وصول ہو گئی ہے سمجھو۔ سچی خوشی بھی آج محسوس کر رہا ہوں۔ پہلے تو ملاقات پر خوشی کی بجائے دکھ ہوا کرتا تھا سوچتا تھا ممکن ہے تمہیں اور کوئی چھین کر لے جائے۔“

”اور کون؟“ جیراں نے بات کاٹ دی۔

”بڑی بھولی ہو جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔“ تھیلا برجستہ بولا۔ کتنے ہی اچکوں سے تمہیں جیت کر لایا ہوں۔ سردار نے سے تو شرط بھی لگ گئی تھی پھر دین جمعدار کا... اور پھوجی ذیلدار کا۔ ان کے بارے میں تو تو خود بھی جانتی ہے۔ کیا کچھ نہ کیا ہوگا ان کمبختوں

نے۔“

”لیکن سراراتوان جیسا نہیں۔“ جیراں نے فوراً کہا ”اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں چکوری بن کر بچپن سے تمہیں پوج رہی ہوں تو وہ کبھی شرط نہ لگاتا۔“

”ہاں“ تھیلا آہستہ سے بولا۔ ”آدمی دل گردے کا ہے اور یاروں کا یار۔“

سردارے نے کانٹی بنی ہوئی چارپائی کی طرح تٹا ہوا بدن یک لخت ڈھیلا پڑ گیا جیسے کسی نے ایکایکی دوائن کھینچ لی ہو۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش آ گئی اور جسم میں بھرے ہوئے انگاروں پر جیسے برف کی تہہ جم گئی ہو۔ اس کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور کندھے پر جمی ہوئی بندوق پہلو پر لٹک آئی۔ بندوق کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے اس نے اپنی انگلیوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی پوروں کو یوں آنکھوں پر رکھ لیا جیسے نہ رکھتا تو پتھر بن جاتیں۔ چند لمحوں کے بعد تھیلے نے گھوڑی کی ٹاپوں کی آواز سنی جو سنائے کو چیرتی ہوئی جا رہی تھیں۔

وہ بھاگ کر چار دیواری سے باہر آیا میرپور جانے والی پلڈنڈی پر کوئی گھڑسوار سرپٹ اڑا چلا جا رہا تھا۔



اناج کی خوشبو

اس بھیگی ہوئی رات کو جمال بابا جھونپڑی کا چھپر سرکا کر اندر داخل ہوا تو فاطمہ بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ کندھے سے کدال اتار کر اس نے ایک طرف رکھ دی۔ کپڑا اس کے تن پر تھا ہی نہیں جو وہ اتارتا، سونگٹو کی ڈوری کتے ہوئے وہ فاطمہ کے قریب آیا اور مینگے کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا ”تو ذرا ساتھ کے چھپر میں ہو جا“ کریم آیا ہے۔“

اس بھیگی ہوئی رات کو جمال بابا جھونپڑی کا چھپر سرکا کر اندر داخل ہوا تو فاطمہ بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ کندھے سے کدال اتار کر اس نے ایک طرف رکھ دی۔ کپڑا اس کے تن پر تھا ہی نہیں جو وہ اتارتا، سونگٹو کی ڈوری کتے ہوئے وہ فاطمہ کے قریب آیا اور مینگے کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا ”تو ذرا ساتھ کے چھپر میں ہو جا“ کریم آیا ہے۔“

فاطمہ پردے میں ہو گئی تو بابا نے دیاروشن کر کے چوکی پہ رکھا اور کریم کو آواز دے کر اندر بلا لیا۔ جھونپڑی کے ایک حصے میں کریم تھا، دوسری میں فاطمہ اور جھونپڑی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والے چھپر کے سرے پر بابا مونڈھے پر آ بیٹھا۔ پیشانی پر ریٹکتے ہوئے پانی کے قطروں کو نچوڑتے ہوئے بابا نے کہا ”صبح سے پھوار پڑ رہی ہے مگر ہوا کچھ بھی نہیں۔“ اس نے مونڈھے کے نیچے سے میلا کپڑا نکال کر جسم خشک کیا۔ پھر آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے دبا کر فالتو پانی بہاتے ہوئے بولا ”حالاں کہ یہ بارس دھانسو قسم کی ہوتی ہے۔ اور مفید بھی ہے۔ کام بڑھ جاتا ہے۔ پر زمانے کے ساتھ ساتھ۔۔۔۔۔۔ اب تو برساتیں بھی بدل گئی ہیں۔ صبح سے اب تک ایک اینٹ کی مرمت نہیں آئی۔“ بابا خاموش ہوا تو سر کے ہوئے چھپر سے بارش کے چھینٹے اندر تک آنے لگے۔

”اپن نے تولڑ کے کوشی کروا کے۔۔۔۔۔۔ یوں سمجھو ایک طرح سے یہ دھندا کچھ۔۔۔۔۔۔ ختم ہی کر دیا ہے۔۔۔۔۔۔“

کریم کہنے لگا ”کام آجائے تو انکار بھی نہیں کرتے نہ آئے تو لوگوں کی زندگی کی دعا مانگتے ہیں۔“ ایک پل چپ رہ کر اس نے بات بڑھائی ”اک عمر گزری ہے مرنے کی دعا مانگتے اب جی چھوٹ گیا ہے۔“

بابا اٹھ کر فاطمہ کے قریب آیا اور سر گوشی کرتے ہوئے بولا ”کھانے کو کچھ ہوگا؟“

”ہے۔“ وہ ایک لمحہ رک کر معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر دھیمی آواز میں کہنے لگی ”مگر فالتو نہیں، چودھواں روز ہے کام نہ ملنے کا۔ خود نغمے گن گن کر کھا رہی ہوں۔ اندر کچھ جائے تو تھنوں میں دودھ بھی آئے۔ گھنٹے بھر سے چمک چمک کر رہا ہے

اس نے کریم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم نے اس کا دیکھا ہی کیا ہے۔۔۔۔۔ میں نے تو اس کا بچپن، لڑکپن اور جوانی دیکھی ہے۔“ بابا رک کر کہنے لگا، اور پھر بچپن میں اس کی بے بسی۔۔۔۔۔ لڑکپن میں اس کی شرافت اور جوانی میں اس کے کارنامے صرف میں جانتا ہوں۔

بچہ دنوں کا ہو اور اس کی ماں مر جائے تو اس کی بے بسی پر رونا کسے نہیں آتا۔ سو میں نے اس کی بے بسی دیکھی بھی ہے اور اس پر رونا بھی ہوں لڑکپن آیا تو میں نے پوچھا بیٹا پڑھو گے یا میرا ہاتھ بنو گے۔ تو اس نے کہا بابا میں تمہارا ہاتھ ہوں۔ اور تمہارا بازو بنوں گا۔“ اس دن سے موت تک وہ بلاشبہ میرا بازو بنا رہا۔ دونوں بازو۔ پڑھانا اسے میں خود نہ چاہتا تھا۔ میری کمائی سے جو دو چار جماعت پڑھ لیتا تو اپنے کام سے بھی جاتا۔ مگر شاید ایسا ہوتا، تو بہتر ہوتا۔ وہ بھاگتا ہوا جاتا اور چنگیوں میں قبر کھود کر سامی تیار کرتا اور بعض اوقات بھاری بھر کم لاشیں بھی اکیلا اور درمیان میں کھڑا ہو کر قبر میں اتار دیتا۔ میت کو قبر میں اتارنے کا وقت کتنا نازک ہوتا ہے۔ پر کیا مجال جو کبھی پاؤں میں لغزش آئی ہو۔ لوگ اس سوگ کے وقت بھی اس کی ہمت کی تعریف کر جاتے۔۔۔۔۔“ بابا کی آواز رندھ گئی۔ میلا کپڑا اٹھا کر اس نے آنکھیں خشک کیں اور کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔۔۔۔۔ ”قدرت مجھ سے ایک نہیں، دو امتحان لینا چاہتی تھی شاید!“

اس کی ماں مری تو میں نے جوانی صرف اسے پالنے میں صرف کر دی۔ یہ امتحان نہیں تھا کیا۔ مگر یوں لگتا ہے جیسے وہی امتحان مجھے دوبارہ دینا پڑے گا۔ وہی جھونپڑی، وہی برساتیں، وہی قبرستان اور اسی طرح کا بے بس بچہ۔ بالکل سوہنے پر گیا ہے۔ ناک نقشہ جو ماں مرنے کے بعد اس کا تھا۔ باپ مرنے کے بعد اس کا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سوہنے نے دوبارہ جنم لیا ہو، بابا خاموش ہو کر دیئے کی بتی اٹھانے لگا۔

باہر بادل اتنے زور سے گر جا کہ کھٹولی پر سویا ہوا مہنگا ڈر کر رونے لگا۔ فاطمہ اسے لینے کے لیے جھکی تو بابا نے کہا ”ایسی کئی راتیں میں نے اسے جھونپڑی میں سلاتے گزار دی تھیں اور پھر ایسی ہی ایک رات مجھے بھولتی نہیں۔ جب مرنے والے کا مرنے والے کو بلاوا آ گیا۔ میں اسے کبھی جانے نہ دیتا مگر یہ اطلاع نواب جمیل احمد خاں کی تھی۔ یوں تو وہ سال بھر سے بیمار تھے۔ مگر مہینے بھر سے جو خبریں مل رہی تھیں وہ بڑی اچھی اور خوشگوار تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ اب بچ نہ سکیں گے۔ ان کی آس بھی پرانی تھی۔ پھر پیر سنی کے پڑوس میں وہ دفن ہونا چاہتے تھے۔ سو تم جانو دس ہزار سے اوپر کا معاملہ تھا۔ سوہنا اس وقت تھکا ہوا تھا اور قبر کھودنے سے کسی حد تک باقی بھی ہو چکا تھا۔“

”وہ کیوں“ کریم نے بے ساختہ کہا ”کوئی نیا دھند انظر میں چڑھ گیا ہوگا!“

”نہیں یہ بات نہیں۔۔۔۔۔“ بابا نے دھیمی آواز اور ست لہجے میں کہا ”اصل میں قصہ یوں ہے کہ جب سے وہ پیدا ہوا تھا اس نے قبرستان کے علاوہ کسی شے پر دھیان ہی نہ دیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ گلاب کی قلمیں لگا کر ان کی آبیاری کرتا۔ قبرستان کی حدود سے باہر نکلا بھی تو کسی چیز پر اس کی نظر نہ جمی۔ جانے اس دن کیا ہوا۔ میں اسے اصرار سے باباجی کے عرس پر لے گیا تھا۔

وہ گیا تو پہلی بار اس نے نگاہیں جما کر پوری دنیا کو دیکھا۔ میلے ٹھیلے، شور و رونق، زندگی۔۔۔۔۔ دیکھتا اور حیران ہوتا ہوا جب وہ مزار پر پہنچا تو طوفان آ گیا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ اسی طوفان میں مسجد کے مینار گرنے سے بیشتر لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے تھے۔ اس چہل پہل کے فوراً بعد اس نے چیختے چلاتے زخموں کو دیکھا اور پھر انہیں اٹھایا بھی۔ بعض ہسپتال جامرے کچھ نے اس کے ہاتھوں میں دم دیا۔ پہلی بار کسی کو مرتے دیکھ کر اس کا تو کلیجہ ہی دہل گیا۔ میں نے اسے تسلی دی مگر اس کا جی جیسے بس میں نہ تھا وہ میتوں کے پرسکون چہرے دیکھنے کا عادی تھا۔ اب ریگتی ہوئی موت کو جسم میں داخل ہوتے اس نے دیکھا تھا۔۔۔۔۔ موت کے کر بناک ہونے کے احساس نے اسے دیوانہ سا کر دیا۔ میں اسے گلے سے لگا کر باہر لایا تو وہ رو رہا تھا۔

ہم واپس آ گئے۔ بہت دیر خاموش رہ کر اس نے کہا ”میں آج سے قبر کھودنے کا دھند نہیں کروں گا۔“

بابا کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا جھونپڑی سے باہر تکتا رہا۔ کریم نے حقے کا کش لیا نہ بابا نے۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا ”ہاں“ میں اسے سمجھا ہی رہا تھا کہ ایک آدمی تین قبروں کے لیے کہنے آیا۔ سوہنے کے انکار پر اس نے سوہنے سے کہا ”شہیدوں کے لیے بھی قبر نہ کھودو گے؟“

”نہیں!“ سوہنا بولا۔

”حادثہ ہوا تھا کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں دربار کی مسجد کے مینار گرنے سے“ اس آدمی کی آواز رندھ گئی۔ سوہنا چونک کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحہ دکھ بھری آنکھوں سے اس آدمی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر چپ چاپ کدال کندھے پر رکھی۔ رسیوں کے ماپ لیے اور قبریں کھودنے چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو بے حد تھکا ہوا تھا۔ بے جان ہو کر وہ چار پائی پر گر پڑا۔

بس۔۔۔۔۔ اسی وقت نواب جمیل احمد خاں کی اطلاع آئی۔ میرا اپنا بھی خیال تھا کہ قبر صبح کھودیں گے۔ مگر نواب صاحب کے بیٹے کا اصرار تھا کہ قبر اب کھودی جائے تاکہ صبح تک اس کا اندرونی حصہ پختہ کرایا جاسکے۔

میں نے سوہنے کی طرف دیکھا، وہ چپ چاپ اٹھ بیٹھا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے نہ جانے دوں۔ مگر میں نے اس کو بالکل نہ روکا .. ہائے۔۔۔۔۔ بالکل یہی رات تھی۔۔۔۔۔ اسی طرح وہ میرے قریب سے گزر کر کدال اٹھانے گیا تھا۔ جیسے فاطمہ ابھی ابھی گزر کر بچے کے پاس گئی تھی۔ پھر وہ موسلا دھار بارش میں باہر نکل گیا۔ میں دروازے میں کھڑا دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ ایک بار بجلی چمکی تو وہ بھاگتا ہوا قبرستان کی دیوار پھاندر ہا تھا۔۔۔۔۔ بس یہی اس کا آخری دیدار تھا۔ بابا نے سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور خاموش ہو گیا۔ جھونپڑی کی فضا بے حد اس ہو گئی تھی۔ بارش کی آواز پر نونے کا گمان ہوتا تھا۔ کافی دیر کی خاموشی کے بعد جب تیز ہوانے پانی کے ذرات اندر تک پھیلا دیئے تو بابا نے کریم کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”پھر۔۔۔۔۔ تمہیں تو نارووال ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ نواب جمیل ہی کی قبر نے اسے نگل لیا۔ کچھ زمین کلرز دہ تھی، کچھ برسات نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ سامی بناتے ہوئے وہ نیچے بیٹھا ہے کہ منوں مٹی کے ٹرے سے تو دے نے اسے اندر ہی پھینچ لیا۔

وہ پہلا دن تھا جب موت سے مجھے ڈر لگا ورنہ اس سے پہلے تو مجھے موت، میت، مردہ، اینٹ، پتھر، مٹی کی طرح لگتے تھے۔ اس دن جب میں فاطمہ کو سسکتا چھوڑ کر قبرستان پہنچا تو یوں لگا جیسے میری کمر ٹوٹ گئی ہو۔۔۔۔۔ ٹوٹی کمر اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ میں نے اپنے ہاتھوں سے مٹی ہٹا کر اسے نکالا۔۔۔۔۔ اس کے چہرے پر کتنا تقدس تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”میں آئندہ قبر کھودنے کا دھندا نہیں کروں گا۔“

جھونپڑی میں اتنی دیر تک سب خاموش رہے کہ دیے کا سارا تیل جل گیا۔ جب بتی جلنے لگی تو سر بیہوڑا کر بابا نے تیل ڈالتے ہوئے باہر چمکتی بجلی میں دیکھا کہ تیز ہوا بارش میں دو شالے بن رہی ہے۔

”آج ضرور کوئی اچھی خبر آنے والی ہے“ فاطمہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔“ حقے کا کش لیتے ہوئے بابا نے کہا ”اچھی خبر نہ کہو اب تو مجبوری سے یہ دھندا کرتے ہیں۔ خدا کرے اکٹھے جنازے نہ آئیں ورنہ مصیبت ہو جائے گی۔“

”اتنے جنازے اپنے نصیب میں کہاں۔“ فاطمہ نے آگ جلاتے ہوئے کہا۔ ”کتنا بھی خرچ اٹھے۔۔۔۔۔ لوگ اب بڑے قبرستان جانے لگے ہیں۔“

”لو سنو“ کریم کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بابا نے کہا۔ ”یہ سب کچھ تو ہوا پر نواب جمیل کی لاش قبرستان نہ آئی پہلے تو جائیداد کی تقسیم میں لاش کی نوچ کھسوٹ ہوتی رہی پھر طے یوں ہوا کہ کسی بڑے قبرستان میں انہیں دفنایا جائے۔“

ڈیرے پر دیکھے ہیں۔ دنوں کی بات ہے جب ایک ولایت پاس بابو مامون کے قبرستان آیا۔ فرنگیوں کی طرح نزی پیتے ہوئے وہ ہر قبر کو ٹھوکر مارتا اور اپنے ساتھی سے چوچھتا ”یہ کس کا قبر ہے۔ یہ کس کا قبر ہے۔“ معلوم ہوتا تھا کہ ولایت جانے کے بعد اس کا پورا خاندان ہی یہیں آسا تھا۔ گندہ گندہ کہہ کر اس نے قبروں کی بے شمار تصویریں اتاریں اور چلا گیا۔ دوسرے روز جب وہ آیا تو وہ بہت خوش تھا کہ تصویریں بہت اچھی اتری ہیں۔ پانچ سو روپے قبروں کی مرمت کے لیے مامون کو دے کر وہ تو ولایت سدھارا اور اینٹیں جو قبروں کی مرمت پر لگی تھیں اپنی اصلی جگہ پر آگئیں۔ مگر بخدا میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ اینٹیں خواہ کچی لگاتا ہوں مگر ادھر کی اینٹ ادھر نہیں لگاتا۔ کوشش کرتا ہوں کہ ہر قبر صاف ستھری رہے۔ قبریں سفید اور صاف ستھری ہوں تو لوگ بچے کھچے پھول بھی ڈال جاتے ہیں۔“ بابا چپ ہوا تو گہرا سناٹا بن گیا۔ فاطمہ نے اٹھ کر دھانے کا چھپر سر کا یا تو چاند پھٹے پھٹے بادلوں سے جھانک رہا تھا اور اس کی اجلی روشنی جھونپڑی کے اندر تک آجھی تھی۔

”بھادوں کی برسات بھی عجیب شے ہے“ کریم نے باہر دیکھتے ہوئے کہا ”ادھر بادل برسات ادھر پھوار اور چاند اور ادھر صاف“ بابا نے نظر اٹھا کر باہر دیکھا تو چپک کر بولا ”کتنا خوب صورت لگ رہا ہے اس وقت بھیگی بھیگی قبریں ٹھنڈی ہوا چاندنی کوئی میری نظر سے اس قبرستان کو دیکھے۔“

کریم نے باہر دیکھا بادلوں پر قبروں کی چھاپ سی لگ رہی تھی قبروں کی طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دور تک چلے گئے تھے۔ پانی میں ڈوبی قبریں اور قبروں میں ڈوبا چاند۔ درخت بو جھل ہو کر جھک آئے تھے اور پانی ٹپ ٹپ ٹپک رہا تھا۔ ”یہ تم کچھ دیکھ رہے ہوتا“ بابا چونک کر کھڑا ہو گیا۔ ”وہ دیکھو۔۔۔۔۔۔ وہ بھیگی قبروں کی درمیانی پگنڈی پر کون چلا آ رہا ہے بھلا۔“

”کوئی عورت لگتی ہے“ کریم نے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔ عورت ہی ہے۔ دیکھو۔۔۔۔۔۔ غور سے دیکھو۔۔۔۔۔۔“ بابا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دروازے تک آ گیا۔۔۔۔۔۔ اور مڑ کر بولا ”ادھر آؤ نا۔۔۔۔۔۔ ادھر۔۔۔۔۔۔ میرے پاس یہ جو کچھ میں تمہیں دکھا رہا ہوں تم نے نارووال کے قبرستان میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔“

ٹھنڈی اور پرسکون خاموشی کے باوجود کریم نے سانس روک رکھا تھا۔ ”اتنی رات گئے یہ عورت۔“ کریم نے اتنی آہستہ کہا کہ شاید بابا سن بھی نہ سکا۔

سفید چادر میں لپٹی لپٹائی اجنبی عورت دھیرے دھیرے بڑھی۔ جب وہ بڑے کے درخت کے نیچے رکی تو ساڑ ساڑ کرتے ہوئے چگاڑوں کی ایک ڈاراڑی اور دائیں طرف مڑتے ہوئے فضا میں جھومر سا ڈال گئی۔

ایک لمحہ رک کر وہ بائیں طرف ایک پختہ قبر پر آکھڑی ہوئی۔ پھر اس نے دیا روشن کیا، پھر پھیلائے، پتھروں کو چوما، کتبے پر ہاتھ پھیرا، آنکھوں کو پلو سے صاف کیا، کہ شاید ان میں پانی تھا۔ کچھ لمحے خاموش کھڑی رہ کر وہ گھومی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی قبرستان کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

کریم سانس روکے سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر بابا نے کھڑے کھڑے دھیمی آواز میں کہا ”چاند رات۔۔۔۔۔۔ اور پونم کی رات دورا تیں ایسی ہیں جو مجھے اس کے یہاں آنے سے یاد آتی ہیں، چاند رات کو اس کے آنے سے مجھے پتا چلتا ہے کہ آج چاند ہوا ہے۔ یہی حال پورنماش کا ہے۔ اب مجھے کب یاد تھا کہ آج پورنماش ہے۔“

”تو یہ سلسلہ پرانا ہے کچھ؟“ کریم بولا۔

”پرانا“ بابا نے ایک لفظ دہرایا۔۔۔۔۔۔ پھر کہا۔ ”سوہناں ماں کے پیٹ میں تھا۔ جب میں نے یہ پختہ قبر بنائی اور ایک نو جوان کو سائی میں اتارا تھا۔ اب تو یاد بھی نہیں کہ وہ کون تھا۔ دس بارہ لوگ جنازے میں تھے۔ قبر کے تیار ہوتے ہوتے پانچ رہ گئے تھے اور بس۔“

چند دن بعد کچھ مستری مزدور آئے اور قبر پختہ کر گئے۔ تب سے آج تک ان دوراتوں میں یہ اسی طرح رات گئے آتی ہے بڑ کے بائیں ہاتھ والی قبر پر دیا جلاتی ہے، پھول پھیلاتی ہے، پتھروں کو چومتی ہے، کتبہ صاف کرتی ہے۔ کبھی کبھی جھک کر قبر سے کچھ کہتی ہے۔ اور پھر چلی جاتی ہے۔ یوں سمجھو لمحے بھر کے لیے سارا قبرستان مہک اٹھتا ہے اور محبت قدم قدم پر بکھرنے لگتی ہے۔“

”اس سے کبھی بات نہیں ہوئی۔“ دیئے کے پاس واپس آ کر کریم نے کہا۔

”صرف ایک بار“ بابا بولا۔ ”صبح تم دیکھو گے کہ اس قبر کے ساتھ ایک کچی ڈھیری ہے جس پہ ایک سفید پتھر محض اس لیے لگا رکھا ہے کہ لوگ اسے قبر سمجھیں۔ اصل میں اس ڈھیری کے نیچے کوئی بھی دفن نہیں۔ اس عورت نے اپنے لیے یہ جگہ مخصوص کر رکھی ہے۔ اسی سلسلے میں ایک بار ایسی ہی ایک رات کو اس سے بات ہوئی تھی۔ بابا کچھ دیر خاموش دیئے کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”جب سوہنا مرا۔ تو مجھے جھونپڑی، قبرستان اور منی سے نفرت ہو گئی تھی۔ مگر اس عورت کا خیال کر کے میری نفرت مر گئی اور غم آدھا رہ گیا۔ میں نے سوچا میرے دو بیٹے تھے۔ ایک قبرستان، دوسرا سوہنا۔ بڑے نے چھوٹے کو نگل لیا تو میں بڑے کو نگا ہوں سے اوجھل

”مگر سونے کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ پھر بھی بڑا تھا۔ خدا کی قسم مجھے تو صرف وہی بڑا نظر آیا ہے۔ ہم تو مصیبت سے سے گھبرا کر سات جنازوں کی دعا مانگنے لگتے ہیں نا۔ مگر اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ بوچوں کے جنازوں پر تو وہ رو بھی پڑتا تھا۔ غریب لوگوں کی قبریں کھود کر اس نے کم ہی پیسے لیے ہیں۔ موت اس کے لیے بے معنی شے ہونے کے باوجود ہم ضرور تھی۔“

بابا ایک لمحہ چپ رہ کر پھر بولا۔ ”یا پھر وہ عورت مجھے بڑی لگتی ہے جو بیس برس سے قبرستان آرہی ہے!“

اس نے سمجھے ہوئے حقے کے دو تین کش لے کر چلم اتاری اور زمین پر الٹ کر صاف کرتے ہوئے فاطمہ کی طرف بڑھادی پھر بولا۔۔۔۔۔ ”دوسروں کے لیے کچھ کرنے والا تو بڑا ہوا پر یہ عجیب بڑائی ہے جو مر کر دوسروں کو پریشان کرتی ہے۔ مجھے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑے بڑے آدمیوں کا قبرستان بنانے میں ہے تو راز مگر بات حلق سے جانے کیوں اچھل پڑتی ہے۔ اس دن پتھروں کی دکان سے گزرتے ہوئے نور کی دکان پر رکا ہوں تو اس نے میری ساری پریشانی بھانپ لی پرانا یار ہے۔ ماتھے کی لکیریں پہچانتا ہے۔ سبب پوچھنے کے بعد وہ مسکرایا اور بولا یہ مشکل تو ابھی آسان ہو سکتی ہے۔ یہ کچھ بکاؤ مال ہے لے لو۔ اس نے ایک لکھے ہوئے کتبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بڑے کام کی شے ہے یہ۔ پچیس برس پہلے کسی نے بنوایا تھا۔ بیٹنگلی کا رواج تھا نہیں۔ سوگا ہک لینے ہی نہ آیا۔ میں نے کتبے کی طرف دیکھا، دو حرف پڑھ تو لیتا ہوں، لکھا تھا ”خان بہادر جمال الدین خان رئیس اعظم جمال پور“ نور پھر بولا ”قبرستان میں ایسے دو کتبے لگے ہوں تو چمک اٹھتا ہے کاروبار۔“

چھوٹے لوگ خود ہی آتے گھبراتے ہیں۔ دنوں میں قبرستان بڑوں کا ہو جائے گا۔ یوں بھی میرے پاس پچیس تیس کتبے تو ہوں گے۔ اول تو یہی کافی ہیں نہ ہوئے تو دکان چھانٹوں گا پھر لے لینا۔“

بات بڑے مزے کی تھی۔ سو میں پہلا کتبہ اٹھا لایا۔

دو دن سوچنے کے بعد میں نے وہ کتبہ سوہنے کی قبر پر لگا دیا۔ پھر میں نے قبرستان کے بھدے کوٹے کو سنوارتے ہوئے جو خالی ڈھیریاں بنائی تھیں نا۔ باقی کتبے ان سب پر لگا دیئے۔ سب کے سب رئیسوں نوابوں کے تھے۔ صبح دھوپ نکلتی ہے تو لگتا ہے جیسے قبرستان میں آتش آں چھڑکی ہو۔

اب یہ فائدہ تو ہوا نا کہ سارا قبرستان بڑوں کا نظر آنے لگا ہے مگر ایک بات ہے۔ جو کچھ جمع کیا تھا وہ اونے پونے خریدنے کے باوجود کتبوں پہ اٹھ گیا ہے۔ پلے تو اب دھیلا بھی نہیں۔

”اور وہ نواب جمیل کے بیٹے والا روپیہ؟“ فاطمہ نے برجستہ کہا۔

بابا نے ابھی کچھ جواب نہیں دیا تھا کہ باہر کسی نے پکارا ”کرم دین۔“

”لو۔۔۔۔۔“ بابا فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔ ”تیری بات کا جواب خود آ پہنچا ہے۔ کب سے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔“ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہ سیدھا اٹھا اور کمر سہلا کر لگنی پر پڑی میلی چٹ واسکٹ اتاری اسے پہنا اور کریم کو ساتھ لے کر

باہر نکل آیا۔

دو آدمی کندھوں پہ کدالیں لیے کھڑے تھے۔ چھوٹے سے سر اور بڑی مونچھوں والے نے آگے بڑھ کر کہا ”چھوٹے نواب کا کام کرنے آئے ہیں ہم“ اس نے بابا کو بات کرنے کا موقع دیئے بغیر بات بڑھائی ”وقت کم ہے ذرا جلدی آ جاؤ۔ دو گھنٹے میں قبریں بھی برابر کرنا ہیں اور دیواریں بھی اسارنی ہیں۔ دوسرے نے پہلے کی بات سے متصل کہا ”ہفتے میں چار گزر بڑھتے جائیں گے۔ رہی مسجد تو وہ کل رات چھپر ڈال کے بنا دیں گے۔“

بابا نے سب کچھ خاموشی سے سنا۔ پھر دور قبرستان کی دو یار کے ساتھ کھڑی ہوئی کار پر اس کی نگاہیں جا پڑیں۔ جس کی اندرونی بتی ایک لمحے کے لیے چمکی تھی۔ سب کے سب کار کی طرف بڑھنے لگے۔ فاطمہ مہنگے پر کپڑا ڈال کر پیچھے پیچھے آئی اور کار سے دور ایک درخت تلے کھڑی ہو گئی۔

نواب صاحب کی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے بابا نے کریم کی طرف دیکھا اور بولا ”نواب صاحب قبلہ آپ کا کام نہ ہو سکے گا۔ مجھے بڑا افسوس ہے۔“ نواب صاحب کار سے باہر آئے۔ میٹھی مسکراہٹ ان کی آواز تک میں مل رہی تھی ”پیسے کم ہیں؟“ انہوں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”جی نہیں؟ مجھ سے یہ کام ہو ہی نہیں سکتا۔ اور پھر دیکھئے نا۔۔۔۔۔ آپ کے چچا مرحوم۔۔۔۔۔ بھی اس جادفن ہیں۔ پھر بھانجے بھتیجے۔۔۔۔۔ ان کا کیا ہوگا۔“

”تم ان کا فکر کیوں کرتے ہو مرنے والوں کو آخر بھولنا ہی پڑتا ہے۔“ ثواب صاحب بولے ”اصل بات کہو سودو سو کی کسر ہو تو“

”اب تو لاکھ میں بھی سودا نہ ہوگا سرکار۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ کوئی اور قبرستان ڈھونڈ لیں۔“

”اور وہ جو تم نے پیشگی لیا تھا۔“ نواب صاحب نے آواز میں ترشی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”وہ غلطی سے لے لیا تھا جناب“ ایک لمحہ رک کر بابا نے واسکٹ کی جیب ٹٹولی اور کچھ میلے میلے نوٹ نواب صاحب کی طرف بڑھا

نواب صاحب نے جھپٹ کر نوٹ لیتے ہوئے کہا ”تمہیں اس حرکت کا مزہ چکھایا جائے گا۔۔۔ حرامی۔۔۔۔۔ ذلیل۔“

”کس بات کا مزہ۔۔۔۔۔ آپ کے خاندان کی ہڈیوں کی حفاظت کا؟“

”میرا کوئی خاندان نہیں۔۔۔۔۔ یہاں سب کتے دفن ہیں۔“

”سرکار اپنے خاندان کو گالیاں نہ دیجئے۔ مجھے دکھ ہوتا ہے۔“

”دکھ کا بچہ۔۔۔۔۔“ مٹھیاں بھینچتے ہوئے نواب صاحب کار میں بیٹھ گئے ”تیرے سارے دکھ نکل جائیں گے۔“

”ایک بات میری بھی سن لیجئے۔ اس مقدس قبرستان کی حفاظت اور آبادی میری زندگی ہے میں اس کے تقدس کو آپ کی فیکٹری

پر۔“

”بکو اس بند کر۔۔۔۔۔ مقدس مقدس“ نواب صاحب نے بات کاٹی۔

مگر بابو بولا ”جی ہاں جناب یہ قبرستان مقدس ہے۔ اس میں میرا بیٹا دفن ہے“ میرا سو ہنا۔ میرے باپ دادا کی ہڈیاں دفن ہیں۔

ہم صدیوں سے اس زمین سے۔ اس قبرستان سے وابستہ ہیں۔ میں اس زمین کو۔۔۔۔۔ ان قبروں کو ان ہڈیوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔“

بابا کی آواز کار کے فرائے میں گم ہو گئی۔ کار دور ہوئی تو بابا کہہ رہا تھا۔

”اور یہاں ایک عورت بیس سال سے ایک ہی قبر پر دیا جلانے آرہی ہے۔ میں کیسے ان کو منوا کر روپے لے لوں۔“

وہ بہت دیر تک کھڑا مسلسل بولتا رہا۔ کریم نے اسے بازو سے پکڑ کر سہارا دیا اور آہستہ آہستہ واپس لے آیا۔ بابا کی آنکھیں

انگارہ ہو رہی تھیں۔

”اپنی زندگی میں یہ کام نہیں ہو سکتا۔ چار پائی پر بیٹھ کر بابا نے کہا ”بعد میں کدال چلے یا پھاوڑا۔“

”نواب صاحب سے بگڑ گئی۔ اچھا نہیں ہوا“ فاطمہ گھبرا کر بولی۔

”تمہیں تو اپنی بات کا جواب مل گیا نا“ بابا جوشیلی آواز میں بولا ”قسم لے لو سینے میں پرسوں سے پھانس انکی تھی۔ اب نکلی ہے۔

بیٹھتی روپے بھجوا کر انہوں نے پیغام کیا بھجوا یا تھا۔ آگ لگا دی تھی۔ بابا کچھ دیر خاموش بیٹھا دیئے کو گھورتا رہا۔ پھر بولا۔ ”دنیا کتنی سنگ

دل ہوتی جا رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا۔ لوگ قبرستان کے لیے زمین دیتے تھے یہ زمانہ اسے واپس لینے کا ہے۔ روز بروز قبریں برابر ہو

رہی ہیں۔ مکان دکانیں فیکٹریاں۔ کیا کچھ نہیں بن رہا یہاں۔ تو بہ ہے“

مہنگا جاگ کر رونے لگا۔ فاطمہ نے گود لے کر دودھ اس کے منہ میں دے دیا اور بولی ”پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ تھنوں میں دودھ

نہیں ہے۔ پیٹ بھر کر کھاؤں دودھ پیوں تو دودھ ڈھلے۔“

نجات

جب مولانا بخش گھوڑی بھروانے ڈیرے پر گیا تو اسے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ آج رات نظام کا نکاح ہے۔ کلمے سے گھوڑی باندھ کر وہ جوانوں میں آیا تو یہ بات سب کے لیے نئی تھی۔ اس لیے گھوڑی جوڑ کر روانے کا کام خود بخود ملتوی ہو گیا اور باتیں نظام کے بارے میں ہونے لگیں، بڑے سے کھجوری پلنگ کے ایک پائے پر بیٹھا جبراً کہنے لگا ”عمر بدنامی میں کنی سوکسی نے ہاتھ نہ تھا“ پر اب بدی کرنے کے قابل ہی کہاں رہا ہے وہ جو کوئی اس سے ڈرے۔“ حقے کا ایک کش لے کر اس نے مولانا بخش کی طرف دیکھا اور بولا ”ہم تو سنی سنائی باتیں کرتے ہیں مگر تم نے تو دیکھا بھی ہو گا چاچا۔۔۔۔۔ شام ہوتی تھی اور گاؤں کا راستہ آنکھوں کی طرح بند ہونے لگتا تھا۔ اکا دکا مرد گزر جائے تو گزر جائے۔ پاس پڑوس کی عورت نہ گزر سکتی تھی۔ راستے کے موڑ پر نظام اپنے پرانے پلنگ اور ساتھیوں کے ساتھ ٹیکری کی شراب لیے تاک میں ہوتا تھا۔ جشن پہ جشن ہوتا اور کسی کوتاہی جرات نہ ہوتی کہ اسے لکار سکے۔ لوگوں نے صرف اس سے نفرت کی تھی۔ جوانی کیا ڈھلی نفرت کی لکیر بھی لوگوں کے دلوں سے دھل گئی۔ چار پیسے اور بڑھا پا دیکھ کر لوگ عزت بھی کرنے لگے اور اب دیکھو اسی گاؤں کی ناری سے اس کی شادی ہو رہی ہے۔“

حق کی نے گھما کر مولا بخش نے منہاں پہ مٹھی جمائی اور کش لینے سے پہلے پوچھا ”کون لڑکی ہے۔“
 ”جیراں! اپنے نواب کی لڑکی“ منڈلی میں سے کسی نے کہا۔

”عمر کیا ہوگی؟“ یہ سوال بھی مولانا بخش نے ہی پوچھا تھا۔ جواب میں جیرے اور کرملی نے دونوں کی عمروں کا حساب لگانا شروع کر دیا۔ پھر دونوں میں سے ایک نے مسکرا کر اعلان کیا۔ ”باسٹھ برس کا گھنا گھاؤ ہے دونوں میں!“ اس نے بات بڑھائی ”جیراں مشکل سے پندرہ سولہ کی ہوگی۔ یوں نظام ہوا آٹھ اوپر ستر کا“ منڈلی ایک قہقہے سے ذرا بکھری تو مولانا بخش اٹھ آیا۔

چھپڑ کے موڑ پہ کھجوروں کے جھنڈ کے پاس جہاں کنارہ ہموار تھا اس نے گھوڑی کو پانی پینے کے لیے چھوڑ دیا اور ساتھ کی مسجد میں چلا آیا۔ مولوی ثناء اللہ کسی بچے کو قرآن پڑھا رہے تھے۔ علیک سلیک کے بعد مولانا بخش نے پوچھا۔ سنا ہے آج نظام کا نکاح ہے؟“

”ساتو میں نے بھی ہے۔“ مولوی ثناء اللہ مسکرا کر بولے ”رجسٹر نکاح تو اپنے ہی پاس ہے۔ مصدقہ اطلاع نہیں ملی تو کیا ہے۔“

انہوں نے مصدقہ کے لفظ کو چبا کر کہا مولانا بخش نے ٹھنڈی سانس بھری اور دھیمے لہجے میں بولا ”کیسا زمانہ آگیا ہے حضرت

جی۔۔۔۔۔ کیسے کیسے نیک لوگ اس زمانے میں بھوکے بیکار بیٹھے ہیں اور اس طرح کے اچکوں کو مولانا رزق بھی دیتا ہے روپیہ بھی اور۔۔۔۔۔“

”ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہوتی ہے مولانا بخشا“ مولوی ثناء اللہ نے بات بدل کر کہا ”تو دل کیوں چھوٹا کرتا ہے؟“

”دل تو چھوٹا نہیں کرتا حضرت۔۔۔۔۔ میں تو مولانا کی شان بیان کر رہا تھا۔۔۔۔۔“ مولانا بخش شاید کچھ اور بھی کہتا کہ ایک عورت نے معراج دین کے ہاں لڑکا پیدا ہونے کی اطلاع دی۔ ”مولوی جی“ وہ بولی ”کپاس کی طرح چٹا اور پونی کی طرح نرم ہے۔۔۔۔۔ نو برس بعد مشکل آسان کی ہے اللہ نے۔۔۔۔۔ اس کے کان میں اذان پڑھوانے کے لیے آپ کو لینے آئی ہوں۔۔۔۔۔“

مولوی ثناء اللہ نے قرآن پڑھنے والے بچے کو چھٹی دیتے ہوئے مولانا بخش سے کہا ”اچھا بھئی۔۔۔۔۔ میں ذرا بچہ مسلمان کر آؤں بے چارہ کافر پڑا ہوگا۔۔۔۔۔“ وہ چلے گئے تو مولانا بخش کتنی دیر تک وہاں موم بتیوں کے کھرنڈ صاف کرتا رہا۔

شام کو نظام کے نکاح پر سب جمع تھے۔ مولانا بخش تک اس اچکے کے نکاح پر آیا تھا اور مولوی ثناء اللہ کا رجسٹر تھا جس پر لکھا تھا۔ رجسٹر نکاح حلقہ نمبر ۱۹ رسومات سے فارغ ہو کر اور رجسٹر نکاح میں اندر راج کرنے کے بعد جب سب لوگ گڑ کے میٹھے چاول کھا چکے تو رات ہو گئی تھی۔ نظام نے خاص طور پر ایک آدمی کو لائیں اور لائیں دے کر کہا ”مولوی صاحب کو مسجد تک چھوڑ کر آنا کہیں موڑ سے نہ پلٹ آنا۔“ مولوی ثناء اللہ نے پچاس روپے کے اس نوٹ کو ٹٹول کر دیکھا۔۔۔۔۔ جو نکاح کے بعد خود نظام نے انہیں پیش کیا تھا۔ اور پھر مولانا بخش کو ساتھ لے کر باہر نکل آئے۔

لائیں والا جوان آگے آگے چل رہا تھا۔ دوسری گلی میں داخل ہونے کے بعد مولوی ثناء اللہ نے اسے آواز دے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ قدم برابر ہوئے تو انہوں نے پوچھا ”اس نکاح پر کتنا خرچ کیا ہے نظام نے؟“

ایک لمحہ خاموش رہ کر اس جوان نے کہا ”باہر جو بات نکھر کر آئی ہے اس حساب سے تو ساڑھے چالیس ہزار لگے ہیں“ لائیں زور سے زمین پر بجاتے ہوئے اس نے پھر کہا ”چھیس ہزار تو لیا ہے سراج نے۔۔۔۔۔ نقد۔۔۔۔۔ اور اپنی لڑکی کے نام جو زمین لگوائی ہے۔۔۔۔۔ لگ بھگ دس ہزار کے وہ بھی ہے۔“

مولوی صاحب اور مولانا بخش نے تقریباً ایک ساتھ لا حول پڑھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر مولوی ثناء اللہ نے کہا ”کیا زمانہ آ گیا ہے۔۔۔۔۔ نقد روپیہ دینا بھی حرام اور لینا بھی۔ اللہ اکبر۔۔۔۔۔“ پھر انہوں نے لمبی آہ بھری اور کچھ دیر خاموش

چلتے رہے۔ پھر سوئی سوئی آواز میں مولا بخش کی طرف دیکھ کر بولے ”جانے اللہ کی کیا مصلحت ہوتی ایسے کاموں میں۔“

مسجد کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے مولانا بخش سے مصافحہ کیا اور لاشعی والے جوان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے حجرے کی طرف چلے آئے۔

تالا کھولتے وقت ان کے ذہن میں نظام کی شادی گھوم رہی تھی۔ تالے میں چابی گھماتے ہوئے انہیں کافی دیر لگی۔ ان کا ذہن جانے کہاں تھا کہ دو تین بار الٹی سیدھی چابی گھمانے کے بعد بھی جب تالا نہ کھلا تو انہوں نے گھور کر تالے کی طرف دیکھا۔ تالا کھلا تھا۔۔۔۔۔ کھلے تالے میں چابی گھمانے کے اس فعل نے انہیں اور بھی سنجیدہ کر دیا۔

[illegible]

پھر کچھ دیر بعد انہوں نے کاغذ کا ایک خالی ٹکڑا لیا اور اس پر دو تین بار ۱۰۰ نمبر ۱۰۰ لکھا اور بڑی دیر تک کان میں ہولڈر کا پچھلا سرا پھیرتے رہے۔ پھر ہولڈر کا پچھلا حصہ صاف کر کے جب وہ اسے کاغذ کے قریب لائے تو ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا انہوں نے ۱۰۰ نمبر کے آگے لکھا۔۔۔۔۔ شفاء اللہ۔۔۔۔۔ اور جلدی سے اسے کاٹ دیا۔ ان کا دل اس تیزی سے تو اس وقت بھی نہ دھڑکا تھا جب انہوں نے سچ مچ پچھلے گاؤں میں اپنے نکاح کے بارے میں جدوجہد کی تھی۔ مگر آج جانے کیا سوئے فتنے جاگ اٹھے تھے۔ ماتھے کا پسینہ پلو سے صاف کرتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر اسی کاغذ پر شفاء اللہ لکھا۔ مگر اب کے اسے مٹایا نہیں۔ بلکہ ایک مسکراہٹ سی ان کے چہرے پر کھل آئی۔

انہوں نے رجسٹر ایک طرف رکھ کر اپنے عمر کا حساب لگانا شروع کر دیا۔ وہ جب اس گاؤں میں امام مقرر ہوئے تھے ان کی عمر سینتیس برس تھی۔ امامت کرتے گیارہ برس ہو گئے۔ یوں کل عمر ہوئی اڑتالیس برس۔ ایک آدھ برس اگر ادھر ادھر بھی ہو جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ کچھ مایوس سے ہو گئے۔ مگر پھر یک لخت ان کی نظروں میں نظام کا لفظ ناچا اور ان کی آنکھوں کلی چمک بن گیا۔ یہ

چمک بھی کچھ دیر پا ثابت نہ ہو سکی کہ اب نظام کے لفظ کے ساتھ ساڑھے چالیس ہزار۔۔۔۔۔ کے الفاظ بھی ابھرنے مننے لگے تھے۔ نظام کی زیادہ عمر اگر ان کی آنکھوں میں چمک پیدا کرتی تو ساڑھے چالیس ہزار کے الفاظ اس چمک کو ایک لفظ میں چاٹ لیتے۔ ساڑھے چالیس ہزار۔۔۔۔۔ ساڑھے چالیس ہزار۔ انہوں نے دیوار کی طرف دیکھا وہاں ساڑھے چالیس ہزار لکھا تھا۔ انہوں نے دائیں طرف گردن موڑی تو یہ الفاظ چتے ہوئے وہاں بھی دکھائی دیئے۔ پھر یہ رقم کبھی ہندسوں میں، کبھی لفظوں میں ان کے سامنے پھیلنے سمٹنے لگی۔ انہوں نے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ یہ ہندسے ان کے چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ دائیں بائیں صف پر، چھپ پر اور پھر تو انہوں نے یوں محسوس کیا جیسے یہ ہندسے سانس کے راستے ان کے اندر تحلیل ہو رہے ہوں۔ انہوں نے ایک بار پھر ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو پونچھا پھر انہوں نے نیکے کاسہارالے کر دیوار سے ٹیک لگائی، تو ان کی نظر روشن دان میں رات گزارنے والے چڑیا چڑے پر پڑی۔ وہ اور بھی پریشان ہو گئے۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ سردی اور اندھیرے میں کسی کے مسجد چلے آنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ سردی کے باوجود انہوں نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔

کچھ دیر بعد جب ان کا ذہن اور سانس اعتدال پر آیا تو انہوں نے اٹھ کر اپنی الماری کا تالہ کھولا اور بڑی احتیاط سے رکھا ہوا ٹین کا ایک ڈبہ اٹھالیا۔ دیے کے پاس واپس آ کر انہوں نے ڈبہ کھولا اور الٹا دیا۔ شرنگ کی آواز پیدا ہوئی اور صف پر روپے انٹھنیوں اور مسلے مسلے نوٹوں کی ایک چھوٹی سی پہاڑی بن گئی۔

کریانے اور نوٹوں کی اس ڈھیری کو دیکھ کر انہوں نے ایک گونہ اطمینان محسوس کیا اور دو تین لمبے لمبے سانس لیے۔ اس اطمینان کے تحت انہوں نے نوٹوں کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھا۔ وہ مسکرائے۔ تو انہیں محسوس ہوا کہ ان کے سینے میں تھوڑی دیر پہلے جو کرب موجود تھا اس میں بڑی حد تک کمی آ گئی ہے۔

انہوں نے ایک ایک کر کے سب نوٹ علیحدہ کئے اور پھر بڑے سلیقے سے انہیں تہ کیا۔ ان کے سامنے ان کی عمر بھر کی کمائی تھی۔ رجسٹر ملنے سے پہلے بھی انہوں نے سینکڑوں نکاح پڑھائے تھے، ہزاروں میتوں کا جنازہ پڑھایا تھا، بے شمار بچوں کے کانوں میں اذانیں دی تھیں۔ عیدوں تہواروں پر عطیات وصول کئے تھے اور تب جا کر اس ڈبے کا تین چوتھائی حصہ پر ہوسکا تھا۔

جب وہ سارے نوٹ طے کر کے الگ رکھ چکے تو جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر پچاس کا وہ نوٹ بھی نکال لیا جو انہیں آج رات نظام نے دیا تھا۔

اس نوٹ کو شامل کرنے کے بعد انہوں نے رقم گنتی شروع کی۔ گھنٹہ بھر بڑی احتیاط سے انہوں نے گنتی کی ہوگی۔ کل رقم سترہ ہزار چالیس روپے اور چند نئے پیسے تھے۔ وہ انہیں دیر تک سامنے رکھے بیٹھے رہے اور پھر انہیں بڑی ترتیب سے ڈبے میں بند کر دیا۔ رقم کو کافی تھی۔ مگر پھر بھی ناکافی تھی۔ اور شاید اسی لیے وہ مغموم ہو گئے۔

پھر جب کسی مرغ نے وقت سے پہلے دو ایک اذانیں دے دیں تو مولوی ثناء اللہ نے ڈبے کو بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ جب وہ دوبارہ دیے کے پاس آئے تو گاؤں بھر کے مرغ اس ایک مرغ کی تقلید میں اذانیں دے رہے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد سناٹا چھا گیا۔ ”یہ تو آدھے سے بھی کم نکلا۔۔۔۔۔۔“ بڑ بڑاہٹ میں انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔ ”مگر وہ تو نظام تھا گاؤں بھر کا بد معاش۔۔۔۔۔۔ بدنام۔۔۔۔۔۔ ہم تو اللہ کے نیک بندے ہیں۔ ہم سے کوئی بھلا۔۔۔۔۔۔ اول تو“ وہ آدھا جملہ بلند آواز سے کہتے اور آدھا سر کی جنبش اور سینہ پھلا کر دل ہی دل میں پورا کر لیتے۔ زور زور سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہوں نے اپنے آپ کو نیچے پر گرایا تو ایک بار پھر ان کی نظر روشن دان میں رات بسر کرنے والے چڑیا چڑے پر پڑی اور ان کے طمینان کو گھن لگنے لگا۔ ایک نشہ سا جوان کی آنکھوں سے دل تک پھیلنے لگا تھا یوں یک لخت ان کے جسم سے خارج ہو گیا جیسے وہ ٹھنڈے پانی کے بھرے تالاب میں جا پڑے ہوں۔ مختلف الفاظ اور بند سے پھر ان کے سامنے ناچنے لگے تھے۔ نظام۔۔۔۔۔۔ ساڑھے چالیس ہزار۔۔۔۔۔۔ سترہ ہزار چالیس۔۔۔۔۔۔ یہ لفظ ناچتے رہے پھر گڈمڈ ہو کر ایک چہرہ بن گئے۔ وہ چہرہ ان کے قریب آنے لگا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ پھر آہستہ آہستہ چہرہ معدوم ہو گیا اور ایک لفظ ابھر کر سامنے آ گیا۔ انہوں نے ایک لمبا سانس لیا تو یہ لفظ ان کے سانس میں مل گیا پھر یوں جیسے ان کے دل میں اتر گیا ہوا اور پھر لبوں سے باہر پھیل پڑا۔۔۔۔۔۔ جینو۔۔۔۔۔۔ جینو۔۔۔۔۔۔ مگر جینو کو تو انہوں نے پندرہ برس پہلے پرانے گاؤں کی امامت کے دنوں میں دیکھا تھا۔۔۔۔۔۔ اور اسی کی خاطر انہیں کسی حد تک رسوائی کا منہ بھی دیکھنا پڑا تھا اور عمر بھر کی کمائی بھی رشتہ کرانے والوں کی نذر ہو گئی تھی۔۔۔۔۔۔ مگر آج۔۔۔۔۔۔ اس وقت۔۔۔۔۔۔ وہ انہیں کیونکر یاد آئی تھی اور کیوں؟ جس نے ان کی آنکھوں میں رنگ اور جسم میں اپلوں کی آگ بھردی تھی۔ انہوں نے گھبرا کر باہر دیکھا۔ بادل گھنے ہو رہے تھے۔ اور شاید بوندیں بھی گر رہی تھیں!

پھر جب اندر مسجد کی گھڑی نے چار بجائے تو انہیں احساس ہوا جیسے اس سے پہلے گھڑی نے کچھ بجایا ہی نہ ہو۔ وہ اٹھ کر باہر نکل آئے اور مسجد کے صحن میں ٹہلنے لگے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور وہ برابر ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ اس سرد بحری سویر کی ٹھنڈی ٹھار پھوار میں بھی۔ ان کا جسم تپ رہا تھا۔!

موذن کے اذان دینے تک وہ صحن میں ٹپکتے رہے پھر نماز کے لیے وضو کرتے ہوئے انہیں اپنی آنکھوں پر انگاروں کا گمان گزرا۔ جلتی آنکھوں اور سلگتے تلوؤں سے انہوں نے نماز پڑھائی اور جلد جلد دعا مانگنے کے بعد قرآن پڑھنے والے سب بچوں کو چھٹی دے دی اور منبر سے ٹیک لگا کر یوں اونگھنے لگے جیسے نجات کا پہلا اسی میں ہو۔

رات بھر جاگنے سے ان کا جسم دکھ رہا تھا۔ مگر اس طرح اونگھنے میں انہیں اس وقت آرام کرنے کی بجائے گھٹن کا احساس ہوا۔ کھلی اور تازہ ہوا کی خواہش خود بخود پیدا ہو گئی۔ انہیں یاد آیا کہ مولا بخش آج نماز میں نہیں تھا اور انہیں آج مولا بخش کی ضرورت اس لیے بھی تھی کہ اس سے باتیں ذرا کھل کر ہو جاتی تھیں۔ وہ اٹھے حجرے کے تالے کو گزرتے ہوئے کچھ بچ کر دیکھا اور باہر نکل آئے۔

مولا بخش کے مکان کی ڈیوڑھی میں داخ ہو کر انہوں نے کمرے سے ملحق کھڑکی میں سے اندر اس کی نون تیل کی دکان میں جھانکا۔ مولا بخش طوطے کے پنجرے میں ابلی ہوئی دال ڈال رہا تھا۔ مولوی ثناء اللہ کے اسلام علیکم کے جواب میں وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مونڈھا گھسیٹ کر آگے کرتے ہوئے بولا ”آج کیسے تکلیف کی حضرت جی؟“

مولوی ثناء اللہ بڑی کوشش سے مسکرائے اور بولے ”آج تم نماز کے لیے نہ آئے تھے سوچا۔ تمہیں تو گاؤں بھر میں ایک پکے نمازی ہو۔ ضرور کوئی بات ہوگی جو نہیں آئے۔ طبیعت خراب ہے کیا؟“

مولا بخش جذباتی ہو کر بولا ”لو۔۔۔۔۔ ہم تو گناہ گار ہیں حضرت جی۔۔۔۔۔ آپ جیسے نیک لوگوں کے طفیل بیڑا پار کروانے کی آس میں جئے جارہے ہیں۔“ ایک منٹ تک تو وہ اپنے گناہ گار ہونے کے ثبوت میں انکسار کا اظہار کرتا رہا پھر بولا ”مٹھو نے کل صبح سے کچھ نہیں کھایا۔۔۔۔۔ آج صبح نماز کا وقت ہو رہا تھا اس نے یوں سانس لیے ہیں جیسے جان ہی تو نکلی جارہی ہو۔ میں تو ڈر گیا حضرت جی۔ خواہ پانچ برس کا ساتھ ہے۔ ٹوٹتے کون سی دیر لگتی ہے۔ ابھی تک اس نے ایک دانہ منہ میں نہیں ڈالا۔۔۔۔۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے کل سے بے حد اس ہے!“

”پنجرے میں قید رہ کر جی گھبرا اٹھا ہوگا۔۔۔۔۔“ مولوی ثناء اللہ نے کہا ”اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے پرندوں اور غلاموں کو آزاد کر دینا چاہئے۔“

”بے شک۔۔۔۔۔ بے شک“ مولا بخش نے زور سے گدن بلا کر کہا ”میرا بھی یہی خیال ہے۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی“ اس نے ایک نظر پنجرے کے کونے میں بھیجی آنکھوں والے طوطے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”سال بھر پہلے میں نے اسے پنجرے سے نکال دیا تھا۔ اس کے پر بھی ٹھیک تھے مگر یہ نہیں اڑا۔ پھر میں نے پنجرہ چھپا دیا اور اسے چھت پر لے جا کر زور سے ہوا

میں اچھا لایا مگر یہ اڑ کر ڈیوڑھی میں آ بیٹھا تھا۔ میں نے بار بار اسے ہوا میں اچھا لایا یہ ہر بار کمرے میں آ گیا۔ حتیٰ کہ آخری بار تو یہ اندر کمرے میں اپنے پنجرے کے اوپر جا کر بیٹھ گیا۔ اور ٹیس ٹیس کر کے احتجاج کرنے لگا۔۔۔۔۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے پنجرہ۔۔۔۔۔ غلامی۔۔۔۔۔ اس کی روح میں سرایت کر گئی ہو۔۔۔۔۔ اب میں اسے آزاد کروں تو کیوں کر۔۔۔۔۔ یہ گھر۔۔۔۔۔ پنجرہ۔۔۔۔۔ یہ ابلی ہوئی دال۔۔۔۔۔ یوں لگتا ہے حضرت جی۔۔۔۔۔ کہ ان تینوں چیزوں میں اس کی راحت اس کی آزادی اور اس کا سب کچھ ہے۔“

”اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہے کوئی۔۔۔۔۔ ہم کیا سمجھیں گے۔“

”ایک بات یاد آئی۔“ مولانا بخش نے مولوی ثناء اللہ کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا ”کل سامنے والے پیڑ پر بہت سے طوطے آئے تھے۔ وہ زور زور سے چلائے تو یہ بھی کچھ ٹیس ٹیس کرنے لگا۔ پھر ایک دو طوطے اس کے پنجرے پر آ بیٹھے۔۔۔۔۔ میں اندر سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ کچھ دیر ٹوں ٹوں کر کے وہ اڑ گئے اور یہ بہت دیر تک چلاتا رہا اور پھر خاموش ہو گیا۔ بس اسی وقت سے یہ ادا اس ہے۔“

مولوی ثناء اللہ نے دھیمے لہجے میں دو تین بار اللہ اکبر کہا۔ پھر معنی خیز نظروں سے مولانا بخش کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”میاں ایک بات تو بتاؤ۔ یہ جو تم طرح طرح کے جانور پال رہے ہو۔ کتا، بلی۔۔۔۔۔ طوطا۔۔۔۔۔ گھوڑی۔۔۔۔۔ بکری۔۔۔۔۔ گھر کو چیز یا گھر بنانے کا ارادہ ہے کیا؟ سیدھی طرح شادی کیوں نہیں کر لیتے۔۔۔۔۔ گھر میں بچے ہوں گے تو آپ آپ رونق ہو جائے گی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔۔۔۔۔ فرض ہے۔ فرض سے کوتاہی ہوئی تو عاقبت کا کیا بنے گا؟ چالیس سے اوپر عمر ہے تمہاری!“

مولانا بخش گردن جھکا کر یوں سوچنے لگا جیسے لا جواب ہو گیا ہو کہنے کو تو مولانا بخش جواب میں یہی بات مولوی ثناء اللہ کو بھی کہہ سکتا تھا اور جس کی غالباً انہیں توقع بھی تھی۔ پر اس نے سوچ سوچ کر صرف اتنا کہا۔ ”اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے حضرت جی!“

اس سے بہتر تھا کہ مولانا بخش کچھ جواب ہی نہ دیتا۔ اس ذرا سے جواب سے اب مولوی ثناء اللہ لا جواب ہو کر اندر ہی اندر کھول رہے تھے۔

”خود بھی تو کوشش کرنی چاہئے۔“ یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے۔ ”وہ ایک لمحے کے بعد بولے ”تم کوشش کرو اللہ کی رضا خود بخود شامل ہو جائے گی۔۔۔۔۔“

دکان پر تین گاہک آ جانے سے بات آگے نہ چل سکی۔ مولانا بخش نے بڑھیا کو شکرا اور بچے کو کڑوا تیل دیتے ہوئے تیسرے گاہک

سے پوچھا "کیا چاہیے؟"

"ایک سیر نیا گڑ۔۔۔۔۔" مولانا بخش گڑ تو لے لگا تو مولوی ثناء اللہ نے لڑکی کو نگاہوں میں تول لیا۔ "اے لڑکی۔۔۔۔۔" وہ گلہ صاف کر کے ذرا ناراضی سے بولے "دوپٹہ ٹھیک طریقے سے لے۔"

لڑکی نے ایک لمحے کے لیے دوپٹہ ٹھیک کر لیا مگر دوسرے لمحے گڑ جھولی میں ڈلواتے ہوئے وہ پھر پھسل گیا۔

ایک لمحے کے لیے مولوی ثناء اللہ کو وہ جینوہی لگی۔ مگر دوسرے لمحے جب وہ چلی گئی تو انہوں نے کہا "کتنی بے حیا لڑکی ہے۔ دوپٹہ سینے پر بٹھہرتا ہی نہیں۔ توبہ ہے۔ کون لڑکی ہے؟"

"دین موچی کی لڑکی ہے!" مولانا بخش نے مسکرا کر کہا۔

"کیا عمر ہوگی اس کی؟"

"عمر؟ ہوگی بارہ تیرہ سال اپنے ہاتھوں میں پٹی ہے۔"

"میرے خیال میں تو بارہ سے زیادہ نہیں" مولوی ثناء اللہ نے کہا "مگر لگتی ہے جیسے پندرہ کی ہے۔" بالکل جوان ہے۔ لڑکیاں اب چھوٹی عمر میں جوان ہونے لگی ہیں۔"

مولوی ثناء اللہ لمحہ بعد پھر بولے "اس چھوٹی سی عمر میں صحت کتنی اچھی ہے۔ کتنا بھرا بھرا جسم تھا۔ ماشاء اللہ۔"

"اللہ کی دین ہے۔" مولانا بخش نے صرف اتنا کہا۔

"بے شک اللہ کی دین ہے" مولوی ثناء اللہ نے تائید کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر دھیمے لہجے میں اللہ اکبر کہا اور پھر چپ ہو گئے اور بہت دیر تک چپ رہے اور پھر جب دھوپ دکان کے دروازے سے اندر بچھی ہوئی دری پر آ بچھی تو مولوی ثناء اللہ اجازت لے لے کر چلے آئے۔

اسی دن عصر کی نماز کے بعد جب مولانا بخش نے حجرے کا دروازہ کھولا تو مولوی ثناء اللہ منہ ہی منہ میں کوئی وعیفہ پڑھ رہے تھے۔ جانے مولانا بخش اس وقت موج میں تھا یا اس کے ذہن میں پہلے سے طے شدہ بات تھی وہ اندر آتے ہی بولا۔ "حضرت جی۔۔۔۔۔"

ایک بات آپ سے کہنا بھول گیا تھا۔" ایک پل رک کر بولا۔ "آپ اپنا فرض پورا کیوں نہیں کرتے؟"

مولوی ثناء اللہ کو فوری طور پر اس سوال کی توقع نہ تھی۔ آیت الکرسی پڑھتے پڑھتے انہیں ہچکی آ گئی۔ گریبان کھول کر لمبی سی پھونک مارتے ہوئے انہوں نے راز دارانہ لہجے میں کہا "میں تو فرض پورا کرنے کو تیار ہوں۔ مگر تم لوگ اپنا فرض پہچانتے ہو نہ

دوسرے کا۔ تم یہ بھی تو فرض ہے کہ مجھے میرے فرائض یاد دلاؤ۔“

ایک منٹ تک مولوی ثناء اللہ مولا بخش کے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ مگر جب وہ چپ بیٹھا چھت کو گھورتا رہا تو تجسس کی آج میں ان کا سانس بھی ناہموار ہو گیا۔ انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بات بڑھائی ”اگر کوئی نیک گھرانہ گاؤں میں ہو۔ تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

”دین موچی کے گھر کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا۔“ یہ دوسرا سوال تھا جو خلاف توقع تھا۔ مولوی ثناء اللہ کو محسوس ہوا جیسے ان کا گلا بند ہو گیا ہو اور سانس لینے میں کچھ وقت پیش آ رہی ہو۔ انہوں نے تھوڑی دیر توقف کیا اور اپنی بے ہنگم اور ناہموار قسم کی مسرت پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ وہ قہقہہ جو ان کے پھیپھڑوں سے اچھلا چاہتا تھا۔ انہوں نے بار بار تھوک نگل کر اسے اوپر نہ آنے دیا۔ پھر بھی انہیں لگا کر دل میں کوئی شے ضرورت سے زیادہ بھر گئی ہے۔ وہ دھیمے لہجے میں بولے ”گھرانہ تو نیک ہے۔“

”نیک بھی ہے اور دین موچی زیادہ نخرے بھی نہیں کرے گا۔ میرے خیال میں بسم اللہ کر کے بات شروع کر دوں۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ مولوی ثناء اللہ نے لمبا سانس لے کر سینے کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

مولا بخش حجرے سے نکلا تو انہوں نے جھر جھری لے کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ پھر منہ پر رومال رکھ کر قہقہہ بھی لگایا اور بند دروازوں کی دراڑوں میں سے باہر دیکھنے لگے۔ دو ایک آدمی نماز پڑھ رہے تھے اور دو چار لڑکیاں کنویں سے پانی بھر رہی تھیں۔ انہوں نے باری باری سب لڑکیوں کا جائزہ لیا۔ وہ غور سے یوں دیکھتے رہے جیسے ان میں سے انتخاب کر رہے ہوں۔ کافی دیر کے بعد انہوں نے نیکی سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر کے صورۂ نور کا پہلا رکوع پڑھنا شروع کر دیا۔

دوسری صبح فجر کی نماز کے بعد وہ بڑی وقار اور امید کے ساتھ مولا بخش کے ہاں گئے۔ حسب عادت انہوں نے ڈیوڑھی میں داخل ہو کر دکان میں کھلنے والی کھڑکی میں سے اندر دیکھا۔ صبح کے اس دھندلکے میں انہوں نے دین موچی کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ ان کے پاؤں زمین پر یوں جم گئے جیسے ان میں من من لوہا بندھ گیا ہو۔ وہ بڑی مشکل سے دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ وہ پھانسی کے تختے پر تو نہیں کھڑے تھے لیکن انہیں محسوس ایسا ہی رہا تھا۔ کتنا سکون تھا۔

انہوں نے نگاہیں پھیر کر یوں آہستہ آہستہ اندر کے ماحول کا جائزہ لیا جیسے ابھی ابھی انہیں چوری کرنا ہو۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ دین موچی بازو ہوا میں لہرا تہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دھیمے مگر جیسے جیسے لفظوں میں کہا ”ابھی تو اس گاؤں میں ہماری تھوڑی بہت عزت ہے مولا بخش اور ہم بے غیرت بھی نہیں یہ تمہیں بھی اچھی طرح علم ہے۔ ہم جو تیاں ضرور گانتھیں۔ مگر مردے نہیں

(۱) الذینہ والذانی فاجلدو کل واحد مائہ جلدہ۔ (نور)

بدکاری کرنے والی عورت اور مرد۔ سو مارو ایک ایک کو سو چوٹ چھی

(۲) ولا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ و مء سبیلاً (بنی اسرائیل)

زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ کیوں کہ وہ بے حیائی ہے اور بہت بڑا راستہ ہے

(۳) ومن کل شیئی خلقنا زوجین (ذاریات)

اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے ہیں

”آپ حضرات نے آیات اور ان کا ترجمہ سنا۔“ کھنکار کر مولوی ثناء اللہ نے کہا ”اب ایک ترمذی کی حدیث پیش کر رہا ہوں

ارشاد ہوا۔ ”تم کو نکاح کرنا چاہئے کیوں کہ وہ آنکھوں کی بد نظری سے روکنے اور شرم گاہ کی حفاظت کرنے کی بہترین تدبیر ہے۔“

”دوستو! پہلی آیت میں کنوارے مرد اور کنواری عورت کی سزا بتائی گئی ہے۔ دوسری میں زنا کے تصور سے باز رہنے کی ہدایت

ہے اور تیسری میں جیسا کہ آپ نے سنا شادی کرنے کی تلقین ملتی ہے اور حضور کی حدیث سے اس کی تائید بھی ہو رہی ہے کہ نکاح

بہترین ذریعہ ہے بے حیائی کو روکنے کا۔ لہذا جو آدمی کنوارہ ہے وہ نکاح کرے اور جو شادی شدہ ہو کر کسی عورت کے حسن سے متاثر ہو تو

اپنی بیوی کے پاس چلا جائے۔ حضور فرماتے ہیں اس کے پاس وہی ہے جو اس کے پاس تھا۔“

مولوی ثناء اللہ نے حرام اور حلال کے فرق کی وضاحت میں بے شمار احادیث سنائیں۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ بھی جو اکثر جمعے

میں صرف ادھکھنے کے لیے آیا کرتے تھے آج بڑے غور سے خطب سن رہے تھے۔ کچھ بیان گھٹ مٹھا تھا۔ کچھ مولوی ثناء اللہ کا

جوش۔

”آپ نے وہ حدیث تو ضرور سنی ہوگی۔ جس میں علماء کے لیے ارشاد ہے کہ وہ ایک سے زائد شادیاں کر لیں تو ان کے لیے بہتر

ہوگا۔“ مولوی ثناء اللہ نے بڑے اعتماد سے کہا ”اس ارشاد کی حقیقت کو اگر آپ سمجھنے کی کوشش کریں تو صاف ظاہر ہوگا کہ زنا اللہ تعالیٰ کو

بے حد ناگوار ہے اور گناہ کبیرہ ہے اور اسی لیے عالم اور امام کو زائد شادیاں کرنے کی طرف خاص طور پر رجوع کیا گیا کہ لوگوں کو راستہ

دکھاتے دکھاتے وہ خود راستے سے نہ بھٹک جائیں۔ آپ ان آیات اور احادیث کو پیش نظر رکھیں تو زندگی پاکیزہ ہو سکتی ہے۔ اور

عاقب سنور سکتی ہے۔ و آخر الدعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔“ خطبہ ختم ہو گیا تو لوگوں کو واقعی ایک تھکنی محسوس ہوئی۔

نماز کے بعد انہوں نے بڑے عجز و انکسار سے دعا مانگی۔ دعا ختم ہوئی تو ایک ایک کر کے سب لوگ مسجد سے باہر نکل گئے۔ وہ

بہت دیر تک تسبیح ہاتھ میں لیے منبر کے قدموں میں بیٹھے رہے۔ مگر اتفاق کی بات کہ کوئی اس دن مصافحہ کرنے بھی ان کے پاس نہ آیا۔ حتیٰ کہ مولانا بخش بھی جلد جلد نوافل ختم کر کے دین موچی کے ساتھ چلا گیا۔ انہیں اس بات کا بھی دکھ ہوا۔ کہ ان کے اس وعظ کا بھی کچھ وقتی سا اثر ہوا ہے کہ لوگوں نے اونگھنے کی بجائے ذرا توجہ سے سن لیا اور بس! مگر یہ مولانا بخش۔۔۔۔۔ اسے کم از کم کچھ بتانا تو چاہئے تھا۔ وہ بڑبڑاتے رہے اور بغیر کچھ پڑھے تسبیح پھیرتے رہے۔

ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسی تسبیح پر گن گن کر سب نمازیوں کو گالیاں دینے لگیں۔ مگر وہ چپ چاپ عصر کی نماز سے کچھ پہلے تک وہیں بیٹھے رہے۔ پھر جب اٹھے تو دن کی پیشانی پسینے سے تر تھی آستین سے پسینہ پونچھ کر انہوں نے بغیر سوچے سمجھے کنویں سے ڈول نکال نکال کر غسل خانہ بھرنا شروع کر دیا۔ آخری ڈول انہوں نے اپنے پاؤں پر الٹا دیا۔ وہ اس وقت ہانپ رہے تھے اور سردی کے باوجود ان کا جسم کھول رہا تھا۔ وہ نہانے کے لیے اندر چلے گئے۔ اور خوب نہائے۔ جسم پر اتنا صابن ملا کہ بدن کھر دھر کرنے لگا۔ اتنا پانی بہا یا کہ گندی نالی میں مدتوں کی جمی گار بہہ گئی۔

باہر آ کر وہ اس وقتی سی آسودگی کے بعد بھی پریشان اور تھکے تھکے رہے۔ وہ ایک بار لاحول پڑھ کر گریبان میں پھونک ماری اور تھکن اور بے زاری کی وجہ سے نماز عصر بھی نہ پڑھائی۔ معذرت کر کے اندر لیٹے رہے اور پھر انہیں نیند آ گئی۔

دو تین دن بعد تک مولوی ثناء اللہ نے نہ جماعت کرائی نہ لڑکوں کو قرآن پاک کا سبق دیا نہ مولانا بخش کے ہاں گئے۔ مولانا بخش بھی ان دنوں ان سے نہ ملا تھا۔ چوتھے روز جب انہوں نے دروازے کے سوراخ میں سے باہر دیکھا تو مولانا بخش جلدی جلدی ظہر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ اس کے کپڑے سفید براق تھے۔ کلف لگی پگڑی کا شملہ سن سن کر رہا تھا۔ داڑھی اس حد تک ترشی ہوئی تھی کہ پہلے سے آدھی بھی نہ رہی تھی۔ اس وقت وہ انہیں بڑا بانکا اور پھرتیلا نظر آیا۔ مولوی ثناء اللہ نے دروازہ کھول دیا۔

مولانا بخش نے سلام پھیر کر حجرے کی طرف دیکھا تو لگا ہیں مولوی ثناء اللہ سے مل گئیں۔ وہ مسکرایا تو مولوی ثناء اللہ کا دل ایک بار بڑی شدت سے دھڑکا۔

مولانا بخش مسکراتا ہوا حجرے کی طرف آیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک نظر آئی۔ جو اس سے پہلے کبھی مولوی ثناء اللہ نے نہ دیکھی تھی۔ خوشی اور روشنی کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ اس روشنی میں مولوی ثناء اللہ کو کوئی پیغام نظر آیا۔ ان کا جی چاہا کہ بھاگ کر مولانا بخش کے گلے لگ جائیں۔۔۔۔۔ مگر وہ اٹھ نہ سکے۔

مولانا بخش اندر آیا تو وہ پہلے سے باوقار نظر آتا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ جم سی گئی تھی۔ مصافحہ کرنے کے بعد اس نے کہا

”اڑ گیا۔۔۔۔۔“ مولوی ثناء اللہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ پچھلی خبر کی حیرت کو انہوں نے اس خبر پر استعمال کیا اور پوچھا ”مگر کیسے؟“

”میں نے عرض کیا تھا کہ کچھ طوطے درختوں پر آ کر ٹیں ٹیں کرتے تھے۔ جس کے جواب میں اس نے آوازیں بھی نکالیں تھیں اور ایک دن اس بھی رہا تھا۔ جانے کیا پٹی پڑھائی ان بوڑھے طوطوں نے رات دروازہ کھلا رہ گیا اور غائب۔“

”عجیب بات ہے۔“ مولوی ثناء اللہ نے دبی زبان میں کہا۔

”یہ طوطا ہے ہی بے وفا جانور“ مولانا بخش نے اٹھتے ہوئے کہا اور اجازت لے کر گھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مولوی ثناء اللہ کو اس پر زیادہ غصہ آیا۔ انہوں نے سو بار اس پر لعنت بھیجی اور پھر اپنا اور نظام کا موازنہ شروع کر دیا۔ انہوں نے نظام کو لچا لنگھا بد معاش اور نہ جانے کیا کیا کہا اور پھر اسے ایک پلڑے میں ڈال دیا اور اپنے آپ کو پارسانیک نمازی اور اللہ کانیک بندہ کہہ کر دوسرے پلڑے میں ڈال دیا۔ مگر جب ترازو اٹھایا۔۔۔۔۔ تو پلڑا نظام ہی کا جھکا۔ نظام کے پلڑے میں انہیں وقار عزت زمین اور وہ لڑکی نظر آئی جس سے اس نے بڑھاپے میں بیاہ کیا تھا۔

اور اپنے پلڑے میں چند وعظ پھینکی نمازیں۔۔۔۔۔ اور وہ لاشیں جنہیں انہوں نے غسل دیا تھا اور لوگوں کی دی ہوئی وہ روٹیاں جو انہوں نے اس کے بدلے میں کمائی تھیں۔ یہ سب اشیاء کھوکھلی اور بے وزن تھیں ان کا پلڑا اوپر ہی اوپر اٹھ رہا تھا۔ انہیں لگا کہ وہ کولہو کا ایک تیل ہیں اور بس۔ گھبرا کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

اسی رات ایک اور واقعہ ہوا۔ مولوی ثناء اللہ کافی رات گئے ابھی اپنے بستر میں جاگ رہے تھے کہ ان کے دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔ انہوں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو علم دین ذیلدار زور سے السلام علیکم کہہ کر اندر آ گیا۔ مولوی ثناء اللہ نے دیا جلا کر طاق میں رکھا اور آنے کا مقصد پوچھا۔

”ایک مسئلہ پوچھنا ہے ا“ علم دین ذیلدار نے برجستہ کہا ”سوچا آپ اس وقت فارغ ہوں گے۔“
 مولوی ثناء اللہ باوقار بننے کی کوشش میں پہلے سے سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد علم دین نے کہا ”مسئلہ تو خیر بعد میں پوچھ لوں گا آپ یہ بتائیے کہ آپ کا باقی کنبہ کہاں ہے۔ میرا مطلب بال بچے سے ہے۔ جس کا گھر گھاٹ بال بچہ ہو وہ یوں گیارہ برس ایک ہی جگہ کیوں کرتائے گا۔“ یہ مسجد اپنا گھر ہے اور نمازی اپنا کنبہ۔“ مولوی ثناء اللہ نے اداس لہجے میں کہا۔
 ”تو آپ اکیلے ہوئے نا۔“ علم دین بولا ”شادی کیوں نہیں کر لیتے“ گھر کی صورت بھی نکل آئے گی اللہ بھی راضی ہو جائے گا۔
 ایک لمحے کے لیے مولوی ثناء اللہ میں بڑھاپے کا احساس جاگا پھر انہیں نظام کی عمر یاد آئی تو وہ مطمئن ہو گئے۔

ان کو خاموش دیکھ کر علم دین نے بات بڑھائی ”اس نیک کام میں دیر نہ ہونی چاہیے۔ آپ رضا مند ہوں۔۔۔۔۔ تو میں بات بھی شروع کروں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“

مولوی ثناء اللہ کے چہرے پر سرخی پھیلتی جا رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ بہت دیر سے بات کا رخ ہی پلٹ دینا چاہتے تھے۔۔۔۔۔ مگر واضح طور پر کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ پھر ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی سرخی ان کی آنکھوں میں اتر گئی۔ جذبات کا ایک ریلہ آیا۔ سارا

وقار ساری سنجیدگی بہہ گئی اور وہ چیخ کر کھڑے ہو گئے۔ ”میں ایسا مذاق پسند نہیں کرتا۔“

”کس دوزخی نے آپ سے مذاق کیا ہے۔“ علم دین ذیلدار بڑی متانت سے بولا ”حضرت جی۔۔۔۔۔ میں بالکل مناسب بات کر رہا ہوں اور شاید آپ اس بات پر بھی یقین نہ کریں کہ میں فیروزاں کا رشتہ آپ سے کرنے کو تیار ہوں۔“ وہ ایک لمحہ رک کر مولوی ثناء اللہ کے ہونٹ پن کو دیکھتا رہا پھر بولا ”اب آپ کہیں گے رشتہ یوں طے ہوتا ہے بھلا۔۔۔۔۔ تو سینے۔۔۔۔۔ فیروزاں میری پہلی مرحوم بیوی میں سے ہے۔ دوسری بیوی کی ساری اولاد اسے اس لیے پسند نہیں کرتی کہ جائیداد میں اس کا حصہ برابر کا ہے۔ میں چاہتا ہوں خون خرابہ ہونے سے پہلے اسے کسی نیک کے پلے باندھ دوں۔ فرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں گا اور جھگڑے بھی ختم ہو جائیں گے۔“

اور واقعی آپ اسے مذاق نہ سمجھیں۔ فیروزاں کو بیاہ لے جانے کے لیے دو ایک شرائط بھی ہوں گی۔“

کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے۔ مولوی ثناء اللہ شرمسار سے چپ چپ بیٹھے تھے۔ علم دین نے کچھ توقف کے بعد کہا ”مثلاً آپ شادی کرنا چاہیں تو آپ کو۔۔۔۔۔ امانت ترک کرنا ہوگی۔۔۔۔۔ کچھ وضع قطع بھی بدلنا پڑے گی۔ کچھ برائے نام سی شرائط ہیں اگر آپ غور کریں تو۔۔۔۔۔ ہمیں تو نیکی چاہئے نیکی حضرت جی۔۔۔۔۔ یوں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔“

مولوی ثناء اللہ اب تک تو خاموش ہی تھے۔ علم دین نے انہیں کندھے سے پکڑ کر ہلایا اور منہ ان کے کان کے قریب لے جا کر سرگوشی میں کہا ”آپ بھی تو کچھ بولیں نا“

”جو اللہ کو منظور۔۔۔۔۔“ مولوی ثناء اللہ نے صرف اتنا کہا۔

”تو پھر پرسوں جمعہ کا مبارک دن کیسا رہے گا؟“

مولوی ثناء اللہ کا دل اتنے زور سے اچھلا کہ انہیں منہ کھول کر سانس لینا پڑا۔ دو تین لمبے لمبے سانس لے کر انہوں نے سانس ہموار کیا اور اس خواب جیسی رات پر یقین نہ کرتے ہوئے پھر حاضر ہوں گا۔ بات ذرا تفصیل سے ہوگی۔ مگر آپ اپنے طور جمعہ کو تیار رہیں۔۔۔۔۔“

علم دین چلا گیا۔

نظام کی شادی کے بعد یہ دوسری رات تھی۔ جب مولوی ثناء اللہ نے پلک نہ جھپکی۔

صبح نماز کے بعد مولا بخش ان کے حجرے میں اپنے نکاح کے سلسلے میں مشورہ کرنے آیا تو مولوی ثناء اللہ نے اس کی بات روک

کزرات کا قصہ سنایا۔ ”تو آپ نے یہ شادی قبول کر لی ہے۔“ مولانا بخش نے قصے کے اختتام پر پوچھا۔

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔؟“

”مگر حاملہ عورت سے تو نکاح جائز ہی نہیں۔“

”حاملہ۔۔۔۔۔؟“ مولوی ثناء اللہ نے جھرجھری سی لی۔ تو مولانا بخش کو احساس ہوا کہ اسے یہ بات اتنی آسانی سے نہ کہنی

چاہئے تھی۔

”تو تم جانتے ہو فیروزاں کو“ مولوی ثناء اللہ نے سنبھل کر پوچھا ”وہ طلاق یافتہ ہے؟“

”میں ہی کیا حضرت جی“ وہ بولا ”پورا گاؤں جانتا ہے۔ اس کی شادی ہوئی نہ اس نے طلاق لی۔ نا جائز ماں بن رہی ہے اور نہ ہی

علم دین کی پہلی بیوی میں سے ہے۔ سوتیلی دوتیلی کا تو بس چکر ہے۔۔۔۔۔ اب بات زبان سے نکل ہی گئی ہے تو چھپانا کیسا۔

فیروزاں سے نکاح کرنے کی بجائے اس کے لیے سو کوڑے تجویز کرنے چاہئیں آپ کو۔“ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا مولوی ثناء اللہ کے

رنگ بدلتے چہرے کو تکتا رہا۔ پھر دھیمے لہجے میں کہنے لگا ”اور آپ خود سوچیں حضرت جی۔ علم دین ذیلدار کی لڑکی۔ اور یوں چپ

چپاتے آپ کے پلے باندھ دی جائے۔۔۔۔۔ معلوم ہوتا ہے سارا گاؤں اس کا بھید جان گیا ہے۔۔۔۔۔ کوئی بھی فوری طور پر

اس سے نکاح کرنے کے لیے تیار نہ ہوا ہوگا۔“

مولوی ثناء اللہ کو تمام رات جگائے رکھنے والی خوشی تو جھاگ کی طرح پہلے جملے سے ہی بیٹھ گئی تھی۔ مولانا بخش کی بعد کی باتوں نے تو

ان کے اندر دکھ کی لہریں پرودی تھیں۔ جو ان کے خون سانس اور خیالات میں رچ رچ کر انہیں جلارہی تھیں۔ انہوں نے خاموشی ہی کو

بہتر جان کر گردن جھکائی تو مولانا بخش نے ہمدردانہ لہجے میں پھر کہا ”آخر یہ گاؤں والے امام اور خطیب کو سمجھتے کیا ہیں۔ پیدا ہونے سے

لے کر مرنے تک اس کی ضرورت ہے۔ پھر اس کو اتنا حقیر کیوں جانتے ہیں۔ اب دیکھئے صاف بات کروں گا تو عیب کہلائے گی مگر

حضرت جی مجھے تو اس گاؤں میں دین موچی سے لے کر علم دین ذیلدار تک سب ایک سے مکار خود غرض اور کھوکھلے نظر آتے ہیں۔

بدکار لڑکی سے آپ کا نکاح۔۔۔۔۔ توبہ! اللہ تعالیٰ کس قدر ناراض ہوگا؟“

دونوں بہت دیر تک چپ بیٹھے کچھ سوچتے رہے پھر مولانا بخش گھٹنے بھر کے لیے دکان پر چلا گیا۔ مولوی ثناء اللہ بہت دیر تک غم سم

بیٹھے رہے۔ پھر جو آہستہ آہستہ اپنے وجود پر نگاہ ڈالی تو انہیں یوں لگا جیسے وہ کوڑے کے ڈھیر پر رکھا جوتی کا کوئی پرانا جوڑا ہوں۔

انہیں آس پاس کے ماحول سے بساند اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ لوگ واقعی نیک بندوں کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ انہوں نے سارے

گاؤں کے نمازیوں کو تصور میں لا کر ان پر ایک سرسری نگاہ ڈالی ان کے چہروں پہ سیاہ محرابوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ انہیں وحشی درندے نظر آئے۔ کسی چہرے پہ تقدس کی کوئی لکیر نہ تھی۔ ”امامت چھوڑ دوں۔۔۔۔۔۔ ہونہد۔۔۔۔۔۔ وہ بڑبڑائے۔ یہ سارے کا سارا گاؤں بے غیرتوں کا ہے۔ اس پر خدا کا عذاب آنے والا ہے۔ مجھے ایک پل کے بغیر۔۔۔۔۔۔ یہاں سے حجرت کر لینی چاہئے۔“ اسی دوران میں ان کے حجرے کا دروازہ اتنے زور سے کھلا کہ وہ ہڑپڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ملاں جی۔۔۔۔۔۔ ملاں جی۔۔۔۔۔۔ نووارد نے اندر آ کر کہا ”جمال خاں کے ہاں آپ کو جلد بلایا ہے۔ میت زیادہ دیر رکھی نہیں رہے گی۔ غسل کا سارا سامان تیار ہے۔“ ایک پل رک کر اس نے پھر کہا ”میں کفن کے لیے لٹھا لینے جا رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ آپ جاتے ہوئے چار پائی لیتے جائیے گا۔“ وہ چلا گیا تو مولوی ثناء اللہ نے دیوار پر زور سے تھوک دیا اور اپنا مختصر سامان جلدی جلدی سمیٹنا شروع کر دیا۔ انہیں اس مردے سے گھن آ رہی تھی۔ جو جمال خاں کے ہاں رکھا تھا اور جسے غسل دینے کے لیے انہیں بلایا گیا تھا۔ انہوں نے الماری سے روپوں کا ڈبہ نکال کر گٹھڑی میں باندھ لیا اور چپکے سے یوں مسجد سے نکلے جیسے مولانا بخش کی دکان تک سیر کرنے جا رہے ہوں۔

گاؤں سے باہر نکل کر انہوں نے مڑ کر گاؤں کی طرف دیکھا انہیں کافور اور کفن کی بو آنے لگی۔ قبر اور مٹی کے دیئے کی زرد روشنی۔۔۔۔۔۔ مسجد کا غسل خانہ حجرے میں بچھی پرالی یہ سب کچھ انہوں نے بند آنکھوں سے ایک لمحے میں دیکھا اور پھر چلنے لگے۔ چلتے چلتے پہلے کما د کے کھیت آئے۔ پھر اناروں کا باغ شروع ہوا۔ اور آخر میں کیکروں کی وہ روش بھی آئی جو جانے والے کو گاؤں سے میل پرے لے جاتی تھی ایک پل رک کر انہوں نے دیکھا۔ دو سو قدم پہ کوئی عورت درخت کے نیچے بیٹھی کچھ کر رہی تھی۔ لاجول پڑھنے کے باوجود انہوں نے بھرپور نگاہوں سے اس عورت کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ اس عورت کے سر پہ دو پٹے نہ تھا۔

چند قدم نگاہ جھکا کر چلنے کے بعد انہوں نے نگاہیں اٹھائیں تو وہ عورت گھبرا کر کھڑی ہو گئی جیسے وہ کوئی چور ہو۔ مولوی ثناء اللہ نے غور سے دیکھا۔۔۔۔۔۔ وہ فیروزاں تھی۔۔۔۔۔۔ اس کا گریبان کھلا تھا۔۔۔۔۔۔ اور تھل تھل کرتی چاتیاں دل دھڑکنے کا پتا دے رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ مولوی ثناء اللہ نے نگاہیں جھکا لیں تو فیروزاں نے کہا ”مولوی جی سلاماں لیکم۔۔۔۔۔۔“

”کیا کر رہی ہو یہاں۔۔۔۔۔۔“ سلام کا جواب سر کی جنبش سے دیتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

”میں۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ وہ کچھ ہکلائی۔۔۔۔۔۔ پھر مسکرائی۔۔۔۔۔۔ مگر چپ رہی مولوی ثناء اللہ نے منہ ہی منہ میں لاجول پڑھ کر درخت کے تنے کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔ وہاں سرخ رنگ کے موٹے دھاگے کے ساتھ ایک تعویذ باندھا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ چپ چاپ تنے کو۔۔۔۔۔۔ پھر تعویذ کو گھورتے رہے۔ پھر ان کی نگاہیں وہاں سے پھسل کر فیروزاں کے ننگے پیروں پر جا

برش اور تلوار

”سچی مچی۔۔۔۔۔ میں اسے روح سے چاہتی تھی۔ میرا پیار سچا تھا اور اس پیار میں ایک بڑی ہی میٹھی کسک تھی۔ جیسے ٹھنڈی چاندنی میں کسی کے انتظار کی کوفت میں ہوتی ہے۔ ایک دھیمی آنچ۔۔۔۔۔ بالکل سلگتی ہوئی آگ۔ جس کا دھواں ہر اونچی چیز کو سیاہ کر سکتا ہے۔ میں بھی اپنے آپ کو اونچا سمجھ رہی تھی اور اندر ہی اندر اس دھیمی آنچ سے جل رہی تھی۔ کوئٹہ راکھ ہو رہا تھا۔ مگر میں نیچے آ کر نہ تو یہ آگ بجھا سکتی تھی اور نہ ہی دھوئیں کو اوپر آنے سے روکنے پر قادر تھی۔ کوئی شے تھی جو مجھے راتوں کو ہولے سے جگا دیتی اور میں اس آگ کو تسلیم کرنے کی بجائے اٹھ کر ٹھٹھکتی۔ اپنی آن و قار اور اونچے گھرانے کی سیزمیں اتر کر میں کیسے نیچے چلے آتی! حالانکہ بارہا میں نے سوچا بھی تھا کہ اس نام نہاد خاندانی وقار کی پروا کئے بغیر۔ اپنی حویلی کے خوش نما، مضبوط اور گھنے درختوں کی چھاؤں میں گھرے ہوئے دروازے سے نکل کر بھاگ بھاگ اس گھائی پر بنے ہوئے خستہ حال پرانے مکان کی ویران دلیز میں پہنچ کر اس تھکی تھکی آنکھوں اور گندمی رنگ کے پڑمردہ چہرے والے نوجوان کے قدموں میں سر رکھ کر اونچی آواز میں کہوں۔ خاندان کا لفظ ایک دھوکا ہے، فریب ہے اور ہمارے درمیان دیوار تعمیر کرنے کا ایک بہانہ۔ ورنہ ہم لوگ کچھ بھی خاندانی نہیں۔ میرے چچا کے پاس تیرہ مربیع زمین تھی۔ جن میں سے آٹھ اب تک رہن ہو چکے ہیں۔ پانچ مربعوں کی آمدن سے شراب اور شباب خریداجاتا ہے اور دوستوں کی دعوتوں کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ بچوں کو تعلیم دینا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ بیوی نے آج تک اسے سچی پیار بھری نظروں سے نہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بازاری عورتیں۔ اس کا سہاگ لوثی ہیں اور وہ بے بس ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ اونچے سطروں والے خاندان کا پرانا دستور ہے۔ سلمیٰ نے ایک بار اپنے سرتاج سے مالی کی جوان لڑکی کو زبردستی شراب پلانے پر دہلی زبان سے احتجاج کیا تھا۔ تو جواب میں وہ طلاق لے کر گھر آ بیٹھی۔ اب تک وہ اپنے گھر میں ہے اور خاندان کو ماتنگ کے سیندور کی طرح لیے لیے پھرتی ہے۔ اس کے بچے ناخواندہ ہیں اور بڑا لڑکا تو اب باپ کے ساتھ مل کر شراب بھی پی لیتا ہے۔ جوان لڑکی کو اس کے چچا نے اپنے دام میں کر رکھا ہے اور ماں کے کلیجے میں چھالے پھوٹ پھوٹ کر ناسور بن رہے ہیں۔ سب خاندان والوں سے متنفر ہو کر بھی وہ کچھ نہیں کر سکی۔ اس نے اپنے باپ کے حکم پر محبت کو ٹھکرایا تھا۔ اس کے باوجود وہ کچھ نہ پاسکی۔ زندہ درگور کر دی گئی۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں ایسا نہیں کر سکوں گی۔ میں اس خاندان کے جھوٹے وقار۔ اور کھوکھلی روایات کا جم کر مقابلہ کرنا جان گئی ہوں۔ دیکھو سہیلی

میرے باپ اور چچا میں بہت کم فرق ہے۔ صرف اتنا کہ چچا نے کوئی بازاری عورت منکوحہ نہیں رکھی۔ کیونکہ وہ کسی ایک کا بن کر رہنا پسند نہیں کرتا۔ مگر ابامیاں پچھلے دنوں ایک بازاری عورت کو گھر میں باقاعدہ نکاح کر کے لے آئے تھے اور گھر آ کر انہوں نے میرے اکلوتے ”ویر“ کو کہا ”یہ تیری نئی ماں ہے۔“

ہماری آنکھیں بھیگ گئیں سہیلی۔

اس لیے کہ جسے وہ بیاہ کر لائے تھے۔ وہ عورت ہرگز نہ تھی اس کی آنکھوں میں ماں کا پیار نہیں تھا۔ اس کا دل درد سے عاری تھا اور احساسات شل تھے۔ اس کے نزدیک اچھے اور برے کی پہچان دولت تھی اور اس کا حسن جعلی اور کھوکھلا تھا۔

میں نے میرے دل نے میرے ویر نے اسے ماں کہنے سے انکار کر دیا تھا۔

اولیہ سانس لینے کو رکی تو کانوں میں ساں ساں ہونے لگی۔ گہرا سناٹا تھا اور ہوا تک ساکت تھی۔ کبھی کبھار کوئی کتارو کر اس منجمد ماحول میں تھوڑی سی حرارت بکھیر دیتا۔ ٹیالا اندھیرا گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اب شاید رات بھیگ رہی تھی۔ میں نے سوچا اتنی رات گئے تک گھر سے باہر نہ کراؤینہ نے اچھا نہیں کیا کہیں اس کے اونچے لمبے باپ کو خبر ہوگئی تو گاؤں بھر میں مصیبت آ جائے گی۔

”آج تو گھر نہیں جائے گی کیا؟ تیرا ویر اب کھیتوں کو پانی لگا کر آتا ہی ہوگا۔ اس کے آنے سے پہلے تیرا یہاں سے چلا جانا ہی بہتر ہے۔“

”تجھے کیوں غم کھائے جا رہا ہے۔ تیرے ویر کا ڈر ہوگا تجھے۔ مجھے کیا کھائے گا وہ۔“ اور پھر وہ میری اگلی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی ”اس سنجیدہ چہرے والے اکہرے بدن کے مصور سے محبت کرنے کی بھی ایک وجہ ہے۔ اس دن گلی میں سخت اندھیرا تھا اور بالکل آج کی طرح رات ٹھنڈی تھی اتنی ٹھنڈی کہ میرا ویر بھی دو مہینے شہر رہ کر لوٹتا تو میں نہ اٹھتی۔

مگر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں کسی قید میں ہوں اور ابایا چچا کے حکم کے بغیر بل نہیں سکتی۔ میرے باغی ذہن نے یہ بات برداشت نہ کی اور میں نے نرم گرم اور گداز بستر چھوڑ دیا۔

احمد خان کی حویلی کے بعد چودھریوں کی بیٹھک بھی گزر گئی اور میں چلتی گئی۔ چوپال پر بنی ہوئی جھونپڑی میں سے دیئے کی مدہم روشنی اندھیرے کے چیرتی ہوئی، مٹی چاٹ رہی تھی۔ میں نے ذرا کی ذرا رک کر دیکھنا چاہا۔ دو تین آدمی کالے کالے دیوؤں کی شکل میں کمبلوں کی بکلیں مارے حقہ گزراتے ہوئے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

دل کی بات مان کر میں نے ان کی باتیں سننے کی کوشش کی۔ اور کھرتلی میں بیٹھ گئی۔ سناٹا اتنا گہرا تھا کہ مجھے ان کے سانس لینے

کی بھی الگ الگ آواز آ رہی تھی۔ نہ بیلوں کی گھنٹیاں بھیں نہ کوئی چگاڈ پھڑ پھڑائی۔ میں نے بے خوف ہونے کی انتہا کر دی تھی حالانکہ اس سے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کوئی چور ہوں۔

کھری میں جس جگہ میں بیٹھی تھی وہاں سے ان کے چہرے بالکل صاف تو نہیں مگر دکھائی ضرور دیتے تھے۔ انہوں نے سروں پر مڑا سے باندھ رکھے تھے اور وہ یوں چوکنے دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے کسی کے شدت سے منتظر ہوں۔ جھونپڑی کا چھپر ایک طرف سرکا تو سامنے کونے میں پڑی ہوئی تینوں بلمیں چراغ کی زرد روشنی میں بھی چمک گئیں۔

پھر ایک دم دور سے گھورے کے ٹاپ سنائی دیے۔ بالکل چوپال کی سیدھ میں کوئی چلا آ رہا تھا۔ اس آواز سے وہ چوکنے اور جھونپڑی کے اندر ہی کھڑے کھڑے اندھیرے میں گھورنے لگے۔ میں کھری میں لیٹ گئی۔

کوئی تیکھی تیز گھوڑی تھی۔ سرپٹ دوڑتی ہوئی یوں اچھلی کہ دونوں اگلی ٹانگیں آسمان کو اٹھ گئیں۔ دو ایک بار ایسا کرنے کے بعد وہ پوری طرح قدم بھی جمانے نہ پائی تھی کہ جھونپڑی کا چھپر اگڑا۔ تینوں آدمی ہاتھوں میں بلمیں لیے باہر نکل آئے۔

تینوں نے بلمیں پھینک کر کبل میں لپٹی لپٹائی چیزیں تھام لی جیسے گرگئی تو چتی چتی ہو جائے گی۔ سسکتی ہوئی کوئی جان دار چیز تھی منہ بندھا ہوا تھا جسے جھونپڑی کے اندر دھکیل کر چھپر پھر سے نکا دیا گیا۔ چاروں کے چاروں یوں کھڑے تھے کہ پیچھے آنے والے کو ختم کر کے ہی دم لیں گے۔

دبلا پتلا سا کوئی جوان تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ اور قدم اب لڑکھڑاہے تھے۔ اندھیرے میں میں نے محسوس کیا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور چہرہ انتہائی پریشان ہے۔ اس کی آواز نے کئی بار اپنے کی کوشش کی مگر پھولے ہوئے سانس نے اسے بے بس کر دیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا جب وہ چاروں کے درمیان آ گیا تو یوں گھڑا ہوا گیا جیسے سنگسار کئے جانے کے لیے گاڑا گیا ہو۔

اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں شل تھے۔ پانچوں کے پانچوں پل بھرتک ساکت اور خاموش رہے۔ جھونپڑی سے کسی کی ہچکیوں کی آواز بلند ہوئی تو دبلا پتلا جوان تڑپ اٹھا۔ اس کی گردن تن گئی اور ہاتھوں میں جیسے حرارت آ گئی ہو۔ پاؤں جھونپڑی کی طرف بڑھے تو تینوں بلمیں اس کی چھاتی سے لپٹ گئیں۔

چچا نے قہقہہ لگا کر جلد ہی اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

”کدھر جا رہے ہو شہریے۔۔۔۔۔۔“ وہ بولا۔

”اوسر۔۔۔۔۔۔ جھونپڑی کی طرف، عصمی کی طرف۔۔۔۔۔۔ وہ میری بہن عصمی ہے“

”تم مجھے قید کر لو۔۔۔۔۔ مجھے مار لو۔۔۔۔۔ اس نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔۔۔۔۔ وہ امانت ہے۔۔۔۔۔ میری ماں نے مجھے سوئپ دیا تھا مرتے وقت۔۔۔۔۔“ وہ برابر ہٹکا کر بول رہا تھا۔

”تم اسے واپس لے جا سکتے ہو“ شیر و چچا آگے بڑھ کر اس کے قریب آ گیا۔ اور اس کے کندھے پر اطمینان سے ہاتھ رکھ کر کچھ دیر اندھیرے میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔

”ہمیں صرف دس ہزار چاہئے۔۔۔۔۔ ابھی۔۔۔۔۔ اسی وقت۔“ شیر و کی جگہ جگاڑا کو ہوتا تو بات بھی تھی۔ جس کے قصے زمانے بھر میں مشہور تھے مگر یہ تو شیر و چچا تھا۔ جو چوپال کے اونچے کھاٹ پر بیٹھ کر مظلوموں کی فریاد سنا کرتا تھا اور ظالم کے لیے سزائیں تجویز کرنے کا ماہر تھا۔

”اس کے بغیر۔۔۔۔۔“ بھائی نے پوچھا۔
 ”قتل کر دی جائے گی۔“ شیر و چچا بڑی بے شرمی سے کہہ رہا تھا۔ ”صبح سورج نکلنے سے پہلے تمہیں اسی جگہ پہنچ جانا چاہئے۔“
 ”لیکن لیکن۔۔۔۔۔ تب تک۔۔۔۔۔ تم اسے۔۔۔۔۔“

نوجوان نے ایک لمبا سانس لیا۔ جس میں کچھ اطمینان کچھ نفرت اور کچھ خوف تھا۔ وہ بغیر کچھ مزید بولے واپس مڑ گیا اور جلد ہی اندھیرے نے اسے چاٹ لیا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہی مصور تھا جس سے مجھے تھوڑی سی پہلے ہی ہمدردی تھی۔ وہ کچھ عرصہ قبل شہر سے آ کر گاؤں میں بس گیا تھا اس لیے کہ گاؤں میں تھوڑی سی زمین سہارا بن رہی تھی۔

ماں باپ ہوتے تو شاید شہر نہ چھوڑتا۔ پر ہوتے تب ناں سہیلی۔ تو اوٹ گھٹنے کیوں لگی ہے۔ دیکھ ابھی تو میں نے بات بھی شروع نہیں کی۔ جاگ جاگ۔۔۔۔۔ سن۔۔۔۔۔ وہ سب کے سب جھونپڑی میں ہیں۔۔۔۔۔ میں کھر لی چھوڑ بھاگی۔ رات تو مجھ سے زیادہ اور کوئی نہ جانتا ہوگا۔ میں نے بہت جلد اسے پانی پیتے ہوئے نہر پر جا لیا۔ وہ بوکھلایا ہوا تھا ہڑا کر مڑا اور یوں میری طرف دیکھنے لگا جیسے میں کوئی بھوت ہوں۔

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں تمہاری ہمدرد ہوں۔“ میں نے اس کی پریشانی بھانپ لی تھی۔
 ”تو۔۔۔۔۔ تو تم بھی ان سے چھوٹ کر بھاگی ہو گی؟“ وہ بولا۔

”ہاں“
 ”تو بھاگ جاؤ ناں پھر۔ ان کے پاس بڑی جوان اور تیز گھوڑیاں ہیں۔ وہ پھر تمہیں پکڑ لیں گے۔“

”تم اپنا قصہ بتاؤ۔۔۔۔۔ مجھے اب وہ نہیں پکڑ سکتے۔“ میرے چہرے پر اطمینان دیکھ کر اس نے کنارے پر اُگی ہوئی خود رو گھاس مٹھی بھرا کھاڑ دی اور رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میری جوان کنواری بہن کی عزت دس ہزار میں رہن پڑی ہے۔ صبح تک دس ہزار نہ ملتا تو فرق کر لی جائے گی۔ مگر تم ہو۔۔۔۔۔ کون؟ میرا وقت کیوں ضائع کر رہی ہو؟۔۔۔۔۔ مجھے جانے دو۔ میں جاتا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ اٹھا

”میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔“

”کیا کر سکتی ہو تم؟“

”میں تمہیں اس ظالم کی بھتیجی کا گھر دکھا سکتی ہوں ابھی۔۔۔۔۔ تم اسے اغوا کر لو۔ دس ہزار کا سوال مٹ جائے گا۔ تمہاری بہن کی عزت اس طریق سے محفوظ رہ سکے گی اور اگر اسے کوئی گزند پہنچا یا گیا تو تم اس کا انتقام اس کی بھتیجی سے لے کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا تو کر سکو گے؟“

”ہونہ۔“ وہ نفرت سے مڑا ”یہ بزدلوں کا کام ہے۔ میں انتقام ضرور لوں گا۔ مگر کسی دوسرے طریقے سے۔ میرے بازوؤں میں قوت ہوئی تو کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا ورنہ اسے جلنا ہی چاہئے۔ ہاں اگر تم میرا زیور زہن رکھو تو میں کم از کم کسی کو منہ دکھانے کے قابل تو رہ سکوں گا۔“ وہ رک کر سوچ رہا تھا۔

”ضرور۔۔۔۔۔ میں یہ بھی کر سکتی ہوں۔ تم صبح کی اذان سے کچھ دیر پہلے مجھے یہیں ملو۔

راستہ بھر میرے دل میں شیر و چچا کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکتے رہے۔ میں اسے اپنے بڑے چچا اور دیگر افراد سے شریف سمجھے بیٹھی تھی۔

وہ ہمدردی جو ایک رئیس زادی کو ادنیٰ سے نو جوان سے تھی۔ محبت کا روپ دھار رہی تھی یا شاید خاندان کی برائیوں سے ازلی نفرت سر اٹھا رہی تھی اور میرے باغی ذہن نے اپنے خاندان کے خلاف کھلی بغاوت کر کے اپنے آپ کو اس نو جوان کے حوالے کر دینے کی پیش کش کی تھی جیسے میں ان سے کوئی انتقام لے رہی ہوں ایسا کر کے۔

آج سے بہت پہلے میں نے اس کے متعلق سنا تھا۔ وہ انتہائی قسم کا سنجیدہ ہے، بہت کم گود بلا پتلا، مصور۔ پھر میں نے اسے دیکھا۔ چھپ چھپ کر دیکھا۔ شاید اس کی کم گوئی ہی مجھے پسند تھی یا کچھ اور۔۔۔۔۔ میں فیصلہ نہ کر سکی۔ مگر اپنی آن کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے اسے کبھی مخاطب نہ کیا تھا۔

میں نے اگر اس سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کے متعلق سوچا بھی تو میرے باپ کی تاحذنگاہ تک پھیلی ہوئی زمین نے میرے دماغ میں الاؤ بھڑکانے کے لیے ایندھن فراہم کر دیا۔ اگر میں نے اسے دیکھنے کے لیے پلکوں کو اٹھایا۔ تو ہمارے باغوں کے اونچے لمبے درختوں نے جھک کر میری آنکھوں کو ڈھانپ دیا۔ اور جب کبھی میں نے اس کی گلی میں جانے کے متعلق غور کیا تو گاؤں بھر کی کچی دیواریں میرے قدموں میں زنجیر بن بن کر لوتے لگیں۔ اس گاؤں کے سارے مکان ہمارے تھے۔ سب باغوں کے درخت میرے باپ کی ملکیت تھے اور پوری زمین پر ہمارا خاندان قابض تھا اور ہر بار یہی رکیک احساس میرے راستے کا پتھر بنتا رہا۔ ورنہ میں اس اجنبی نوجوان کو بہت۔ بہت پیار کرنے لگی تھی، کیوں؟ یہ میں نہیں جانتی۔

اور آج پہلی بار۔ بلا جھجک اس سے گفتگو کر کے اور اس کا دکھ جان کر پریشان سی ہو گئی تھی۔

دس ہزار کی رقم میرے لیے کھ بھی مشکل نہ تھی۔ بڑی آسانی سے وہ مجھے انجینی الماری سے مل گئی اور میں اسے لے کر بہت پہلے ہی نہر کے پرانے موڑ پر پہنچ گئی۔ موڑ سے کچھ دور وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھا رو رہا تھا۔ میں نے بغیر کچھ کہے دس ہزار اس کی جھولی میں ڈال دیے۔ وہ یوں چونکا جیسے اپنی بہن کو اغوا ہوتے دیکھ کر چونکا ہوگا۔ اس نے جلدی سے آنسو خشک کئے اور بولا ”یہ رقم میں تمہیں بہت جلد لوٹا دوں گا۔ چاہے مجھے اپنی زمین ہی کیوں نہ بیچنی پڑے مگر تم کون ہو؟ میں یہ روپے کیسے دوں، کہاں دوں، کب۔ کیوں کر۔۔۔۔۔۔ میری محسن مجھے سب کچھ جلد جلد بتا دو۔ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

میں نے بمشکل کہا ”بس یہ جان لو کہ یہ ایک ایسا جسم ہے ایک ایسی روح ہے جو تمہاری ہمدرد ہے۔ تمہیں پسند کرتی ہے تمہیں چاہتی ہے۔ تمہارے لیے انہی راہوں پر بار بار ہانگی ہے۔ مدتوں تمہاری تلاش میں سرگرداں رہی ہے اور اب اس نے تمہیں پالیا ہے۔ بس!“

وہ بولا ”آٹھ روز بعد میں تمہیں یہیں ملوں گا۔ جمعہ کی رات آئے گی اس دن۔ تم یہاں آ کر اپنا روپیہ لے جانا اور یہ زیور مجھے لوٹا دینا۔ یہ میری ماں کا ہے۔ جو مرتے وقت عصمی کے ساتھ میرے پاس امانت رکھ گئی تھی۔ دیکھنا اپنے پن کی لاج رکھنا۔“ وہ تیزی سے اٹھ کر جنگلوں کی طرف بھاگ گیا۔

آٹھویں دن وہ مجھے وعدے کے مطابق وہیں مل گیا۔ وہ رو رہا تھا۔ بقول اس کے اس نے دو روز قبل اپنی ساری زمین بیچ دی تھی اور اس گاؤں سے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ جب وہ اپنا زیور واپس لے چکا تو روپوں کی تھیلی میری طرف بڑھائی۔ میرے انکار پر وہ ذرا جوش سے بولا ”یہ روپیہ اس ظالم ہی کے گھر کا ہے۔ میں اسے کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ تمہارا دیا ہوا روپیہ

شاید اسی لیے کچھ نہ کر سکا کہ وہ ایک ظالم کے گھر کا تھا۔ روپیہ لینے کے باوجود۔۔۔۔۔ انہوں نے۔۔۔۔۔ انہوں نے۔۔۔۔۔ میری بہن کو مجھ سے چھین لیا۔

دوسرے ہی دن میری بہن نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔ تم شاید نہیں جانتیں۔ اس کا جسم مجھے واپس کیا گیا تھا روح کچل دی گئی تھی۔ وہ مجھے کچھ بھی نہ بتا سکی۔ باغیرت تھی نا۔۔۔۔۔ باعزت مر گئی۔ میری رگوں میں بھی وہی خون ہے۔ جواب تک برش چلاتا آیا ہے اب تصویریں نہیں بنائے گا، تلوار تھامے گا، تقدیر بنائے گا۔

آج سے ٹھیک ایک برس بعد۔۔۔۔۔ جنوری کی تیس تاریخ کی رات کو تم سب کچھ دیکھ سکو گی۔ اس دن اگر کچھ ٹھنڈا ہو گیا تو تمہاری محبت، عقیدت اور ہمدردی کے سامنے گردن جھکا دوں گا ورنہ۔ میری لاش۔۔۔۔۔ میری بہن کی قبر کے ساتھ فن کر دینا۔ تمہیں اگر واقعی مجھ پر اعتماد ہے۔ تو اس گھڑی کا انتظار کرو۔“

”بس! وہ دس ہزار روپے کی تھیلی زمین پر پھینک کر دور کھڑی ہوئی گھوڑی کی طرف چلا گیا۔ میں پکارتی رہی اس نے ایک نہ سنی۔ گھوڑی پر سوار ہو کر صرف اتنا بولا ”جنوی کی تیس۔ آج سے ایک برس بعد۔“ دور تک اس کی گھوڑی کی ٹاپیں سنائی دیں اور پھر گہرا سناٹا چھا گیا۔

کچھ دن تو مجھے اس کے واپس آ جانے پر یقین ہی نہ آیا۔ پر جوں جوں دن گزرتے گئے۔ ایک نامعلوم سا احساس شدید ہوتا گیا۔ ضرور آئے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔ کوئی خزاں رسیدہ گرتے ہوئے پتوں کی زبان بن کر میرے دل سے کہتا۔ میں چلتے چلتے رک کر دور ٹیلوں کی طرف دیکھنے لگتی۔ جیسے وہ ابھی ان ٹیلوں کے پیچھے سے برآمد ہوگا۔ اس کی گھوڑی ہنہٹا کر رک جائے گی۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر میرے قریب آ جائے گا اور کہے گا۔ ”میں تمہیں شہر لے جانے کے لیے آیا ہوں الوی!۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“

مگر وہ نہیں آیا۔ جنوری کی تیس تو آج ہے۔ پورا ایک برس ہو گیا اسے گئے ہوئے۔ بس وہ آتا ہی ہوگا۔ ہے ناں؟“ الوینہ دیوانوں کی طرح میری آنکھوں میں جھانک گئی۔ میری آنکھیں نیند کے خمار سے تقریباً بند ہو رہی تھیں۔ شاید میں اب اس سے اجازت لینے کی بجائے زبردستی اٹھ جاتی کہ وہ خود ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ لو میں چلی نہروالے ڈیرے پر۔ اس کے آنے کا وقت بہت قریب ہے۔“ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

بادل اتنے گہرے تھے جیسے سیاہ کمبلوں میں لپٹے ہوں۔ رات بھیگ بھاگ کر سناٹے سے ہمکنار تھی۔ کتے رورو کر سو گئے تھے۔ میں ڈر رہی تھی جیسے الوینہ پاگل ہو۔ جانے اس نے کیسی کیسی باتیں کی تھیں مجھ سے۔ مجھے تو ایک خواب نظر آ رہا تھا۔

مجھے افسوس ہے میں خود نہیں آسکا۔ محض اس لیے کہ میں بزدل ہوں میں نے اپنے برش توڑنے کی بے حد کوشش کی۔ ناکام رہا۔
جو ہاتھ برش نہ توڑ سکیں، تلواریں اٹھا سکتے۔ میں شرمندہ ہوں۔ تمہیں بھی نہ اپنا سکا!!
باہر گلی میں الوینہ کے قہقہوں سے بے ہنگم چیخیں لپٹ رہی تھیں۔



نفرت کی دیوار

گاؤں کی عزت کا سوال نہ ہوتا تو کیا ضرورت تھی منشی چراغ کو دخل دینے کی۔ وہ تو آج تک کبھی۔۔۔۔۔ کسی جھگڑے میں اپنی دلچسپی کے لیے نہ بولا تھا۔ گاؤں بھر کے لڑائی جھگڑوں، میلیں ٹھیلوں سے وہ نفرت تو نہیں پر گریز ضرور کرتا تھا۔ شادی اگر کسی ایسی لڑکی کی ہوتی جس کی برات گاؤں کے باہر سے آنا ہوتی تو مجبوراً اسے بھی جانا ہی پڑتا ورنہ عام شادی بیاہ میں تو وہ کبھی۔۔۔۔۔ نظر نہ آیا تھا۔

لیکن یہاں تو معاملہ ہی اور تھا۔

گاؤں کے چھتے ہوئے بدمعاش نورے بشکلی نے احمد خاں سفید پوش کی کنواری لڑکی فیروزاں کو کھیتوں میں زبردستی روک کر اس کا ہاتھ چوم لیا تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے تاجے کمہار کا جو اس وقت کھیت سے نمبردار جی کا چارہ لارہا تھا۔ اور جسے دیکھتے ہی نورابھاگ گیا تھا۔ ورنہ مواء گاؤں بھر کی ناک کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ لیتا شاید!

بات اب بڑھتے بڑھتے پیچوں تک آ گئی تھی۔ فیصلہ انہی کے ہاتھ میں تھا۔ منشی چراغ کو خاص طور پر بلاوا تھا اس لیے اسے مجبوراً جانا پڑا۔

شاید انباتوں میں ان کی جوانی کی پرچھائیاں تھیں، جیتی ہوئی کہانیوں کی مہک تھی زندگی کے اجلے دنوں کی رنگینیاں اور لمس تھا، بہر حال کچھ تھا ضرور جس میں جوانوں سے زیادہ بوڑھے پیش پیش تھے۔

تاجا کمہار، منشی چراغ کا اشارہ پا کر کھڑا ہو گیا اور بات شروع سے آخر تک دہرا دی۔

کچھ دیر پورے ڈیرے پر سناٹا چھایا رہا۔ سب کی گردنیں یوں جھک گئیں جیسے انہوں نے ابھی ابھی کسی کو لحد میں اتارا ہو۔

پھر آہستہ آہستہ پہلے طرے ہلے پھر مونچھوں پر ہاتھ پھرے اور تب کہیں جا کر منشی چراغ کے ہونٹوں کی باری آئی۔

”تو اپنی صفائی میں کچھ کہے گا؟“ بات کا رخ نورے کی طرف تھا۔

نورے نے یوں آہستہ سے گردن گھمائی جیسے وہ کوئی کل دار کھلوانا ہو۔ پھر اس نے نظریں اٹھائے بغیر کھنکار کر کہا۔

”چاچا۔۔۔۔۔ دینے کی بات۔۔۔۔۔“ وہ رک گیا۔

”تم کہنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ غلط ہے۔“ منشی چراغ نے گہرہ لگائی۔

”نہیں چاچا منشی۔۔۔۔۔ اصل میں دین کے ڈیرے پر مچھیوں نے محول محول میں بھنگ کے پکوڑے کھلا دیئے تھے۔۔۔۔۔ ورنہ میری کیا مجال۔۔۔۔۔“

بات بڑی معقول تھی۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔ نورے کو سزا ملتے ملتے رہ رہی تھی۔

اور بہت سے تو صرف بیٹھے ہی اس لیے تھے کہ نورے کو سزا ملتی دیکھیں ان کی آرزوؤں پر اوس پڑ گئی تھی۔

قمرے جام کو ایک دن نورے نے سب کے سامنے گالیاں دی تھیں۔ کیوں کہ قمرے نے اسے نماز پڑھنے کی تلقین کی تھی۔ قمرے کو اس کا رنج تھا۔

کرملی کو اپنی جوانی پر ناز تھا اور اس سے زیادہ اپنی پہلوانی پر۔ کشتی میں بہت سوں کو بچھاڑنے کے بعد وہ کسی بات پر نورے سے لڑ پڑا اور اپنا ایک دانت تڑوا بیٹھا۔ کرملی کو یہ بات کھا گئی تھی۔ پہلوانی چھوڑ کر اس نے کیکر کی شراب پینا شروع کر دی تھی۔ وہ آج یہاں تماشائی تھا۔

لال جمعدار جب ایک رات گھر سے باہر تھا۔ نور اس کے گھر کی دیوار پھاند کر اندر چلا گیا۔ لال کی بیوی سمجھ دار نہ ہوتی تو سب کچھ گنوا بیٹھتی۔ اس نے نورے کو رات کا پکا حلوہ کھلایا دودھ پیش کا اور پھر آٹھ روز بعد ملنے کا وعدہ دے کر رخصت کر دیا۔ صبح یہ بات نمبردار کے گھر سے لے کر جے موچی کے بچے کی زبان تک پہنچ چکی تھی۔

لال جمعدار گھر لوٹا تو یہ بات مقدمہ بن کر پنچایت میں گئی۔ مگر نورادہاں سے نشے کا بہانہ کر کے صاف چھوٹ گیا تھا۔

یہ سب آج اپنا اپنا انتقام سینوں میں دبائے سزا ملنے کے منتظر تھے۔ نور اہر بار تو بیچ کر نکل گیا تھا لیکن آج معاملہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ مولابخش تیلی کی لڑکی ہوتی تو شاید یہ بات چوپال تک آ ہی نہ پاتی، مگر یہ تو احمد خاں سفید پوش کی اکلوتی لڑکی فیروزاں تھی۔

سب سے پہلے کرملی اٹھا اور منشی چراغ کو اپنی طرف متوجہ کر کے بولا ”یہ جھوٹ ہے منشی جی جب یہ لال جمعدار کے گھر جا چکا تھا تب بھی نشے میں تھا اور آج پھر“

”ہر بار تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور پھر شغل شوق کرنے والوں کو تو شہو ہوتا ہی نہیں۔“ لال جمعدار نے کرملی کی بات کاٹ دی تھی۔

قمرے نے تو شراب کا نام آتے ہی لاجول پڑھنا شروع کر دی تھی وہ تو اس کے نام سے ہی گھبرا گیا تھا۔

منشی چراغ نے رخ کرملی کی طرف پھیر لیا۔ تیری بات کسی حد تک تو ٹھیک ہے کرم الہی لیکن اگر نورے کو واقعی بھنگ کے پکوڑے

بھلے بھلے جملے تھے۔

سب کے سب ٹولیوں میں بٹ کر آس پاس آم کے گھنے درختوں کے سایوں میں بکھر گئے۔

شام ہو رہی تھی۔ دین کے ڈیرے پر گھنے درخت ہونے کی وجہ سے گہرا اندھیرا معلوم ہو رہا تھا۔ ڈیرے میں بڑا سا کھجور کے پٹھے سے بنا ہوا پلنگ پر جبرائیل اسرار، موج خاں دھوبی اور شاننا پٹواری خاموش ادا اس اور سرنگوں بیٹھے تھے۔ ان سے دو چار قدم ہٹ کر نور اعلیٰ کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر انتقام نفرت اور غصے کی لہریں رقصاں تھیں۔

ہوا چلی، پتے سرسرائے، لیٹا ہوا کتا چونک کر زور زور سے بھونکا پر کسی نے توجہ نہ دی۔ وہ سب کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

نورا، جبرے سنار کی طرف منہ پھیر کر بولا ”استاد اب چھ مہینے کا سوال نہیں، عزت کا سوال ہے۔ ایک دن کے لیے گاؤں بدر یا ایک سال کے لیے، میرے لیے برابر ہے۔ میں تو اب اس گاؤں سے ہمیشہ کے لیے چلا ہی جاؤں گا۔ مگر دل میں بھڑاس کیوں رہے، اسے نکالنے کا راستہ مجھے معلوم ہے“ وہ ایک پل رکا اور پھر کچھ سوچ کر بولا ”زمین کا فیصلہ تو صبح ہو ہی جائے گا۔ رہا مکان تو وہ میں تمہیں سونپ رہا ہوں۔ اس کے بدلے میں تم مجھے بندوق دے دو۔“

”بندوق کا سوال بڑا میٹھا ہے یا۔۔۔۔۔“ حیرے سنار کی بجائے شانا پٹواری جلدی سے بولا۔

”گاؤں بھر میں تین ہی تو بندوقیں ہیں کل احمد خاں سفید پوش، نمبردار خان اور جیرے کے پاس۔ تو تو بھاگ جائے گا اور قابو کر لیا جائے گا جیرا۔ تیرے پاس اپنا دیسی پستول جو ہے؟“

وہ خراب ہے سرکار جی۔ نور اے ساختہ بولا۔

”تو ٹھیک ہو سکتا ہے ویرجی۔“ ستانا نورے کے سے لہجے میں بولا ”عمل خاں لوہار کو نہیں جانتے کیا۔ پورے جمشید پور میں اس کا جوڑ نہیں۔ ایک پہر میں پستول کی آنتیں بدل کر رکھ دے گا۔“

”بس پھر۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے مگر یہ کام“ نور ارکا اور نگاہیں موج خاں پر جماتے ہوئے بولا ”یہ کام تمہارا ہی ہے موبج۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ تولادے مجھے انکار ہے کیا۔۔۔۔۔“ موج خاں نے مسکرا کر کہا ”مگر نوریا۔۔۔۔۔ ایک بات تو بتانا۔“ اب کے شاناپنواری پھور بولا ”تیرے پاس ایسی ہی ہیریں ہیں پھر تمہیں احوں کی لڑکی سے چھیڑ کرنے میں کیا مزہ ملا۔ سانولی سی چھوٹے قد کی بے سری لڑکی ہے وہ۔“

”شان بی بی۔“ نور اذرا سا مسکرایا۔ ”اس کا جواب کیا دوں میں؟ پھر بھی تمہیں سمجھاتا ہوں“ لے سن۔ بات صرف ضد کی ہے۔ وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی اور مجھے ضد تھی کہ قابو نہ کر لوں تو نور اذرا مشکل نہیں۔ نفرت کرنے کا بھی طریقہ ہوتا ہے کچھ۔ کچھ کر منہ پھیر لینا تو معمولی بات ہے۔

مگر جب کبھی میں ان کے دروازے کے سامنے سے گزرا ہوں تو دروازہ اس زور سے بند کرتی تھی کہ درازوں میں پھنسا ہوا کیچڑ تک نکل پڑتا۔ اور پھر میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ ترنجن میں بھی میرے خلاف خواہ مخواہ باتیں بناتی رہی ہے۔ بس اس نفرت کا مزہ چکھنا چاہتا تھا اسے۔ تا جا کم بخت نہ آتا تو فیصلہ۔۔۔۔۔ ہو جاتا۔۔۔۔۔ خیر اپنی ضد ابھی تک قائم ہے۔ پوری نہ کر لوں تو وریان کا بیٹا نہ کہنا۔“ نور اہل بھر کے لیے رکا اور پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا پھر اس نے اپنا منہ شانے کے کان سے ملا کر سرگوشی کی۔ ”اگر آج پستول مل گیا تو فیروزاں میرے ساتھ جائے گی۔“

”کہاں؟“ سب حقے کی نے بھول کر بولے۔

”جہاں میں جاؤں۔۔۔۔۔“ نور اذرا جوش سے بولا۔

”ہمیں بھی تو دیدار درشن دیا کرو گے۔۔۔۔۔“ حیرے سنار کی بات کٹ گئی۔

”کیوں نہیں بعد میں بتا دوں گا کسی آتے جاتے کے ہاتھ“ نور اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور موج خاں کی طرف گہری نظر سے دیکھ کر

بولاً۔

”چل بھئی۔ میں تمہیں پستول اور باگی دیتا ہوں۔ صبح کی پیاسی ہے۔ پانی پلا لینا راتے سے۔“ وہ دونوں گھر کو چل دیئے۔

ڈیرے میں حیرے سنار اور شانے پنواری کی سرگوشیاں رہ گئیں۔ جورات گئے تک ہوتی رہیں۔

صبح ہونے سے بہت پہلے موج خاں جمشید پور سے لوٹ آیا۔ آتے ہی سیدھا وہ دین کے ڈیرے پر پہنچا تو نور اذرا اس کا منتظر تھا۔ اس کے ساتھ اس کے جگری دوست حیرا اور شانہ بھی وہیں سوئے پڑے تھے۔ مگر نور اذرا جاگ رہا تھا۔ جب موج خاں باگی سے اترتا تو نور اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”موہے یار۔۔۔۔۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

”کام ہو گیا میرے دیر کا۔“ موجا بڑی اونچی آواز میں بولا اور تیز تیز چلتا ہوا بالکل نورے کی چارپائی کے قریب آ گیا ”آٹھ

گولیاں بھی لیتا آیا ہوں۔“ موہے نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

”سچ؟“ نور اچھ کچھ حیران ہوا۔ ”کہاں سے؟“

”عمل خاں کے پاس پہلے ہی سے موجود تھیں۔“ موبے نے جیب سے مٹھی بھر سنہری چمک دار گولیاں نکالیں اور نورے کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔

نور ایک منٹ تک گولیوں کو گھورتا رہا، سوچتا رہا۔ پھر اس نے گولیوں کو واسکٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے کہا، ”یہ تو سات ہیں موبے۔“

”ایک پستول میں بھری ہوگی۔“ موج خاں لا پرواہی سے بولا اور نورے ہی کی چار پائی پر لیٹ گیا۔

صبح ہونے میں کچھ ہی دیر باقی ہوگی۔ باگنی ہنہنائی تو شاننا پٹواری اور جیراسناریوں جاگ پڑے جیسے وہ اسی کے ہنہانے کے منتظر تھے۔ دونوں نے آنکھیں کھولنے کے بعد ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرائے اور پلنگ سے اٹھ کر کھری والے تخت پوش پر آ بیٹھے۔

فضا میں ہلکی ہلکی ٹھنڈک رچ گئی تھی۔ اندھیرا صرف اتنا تھا کہ چہرے کے نقش پہچاننے میں ایک لمحہ انتظار کرنا پڑتا پھر مسجدوں میں اذانیں ہونے لگیں۔ مرغ پھر پھڑپھڑائے اور ہلکا نور اندھیرے میں گھلنے لگا۔

شاننا کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے انگڑائی لی اور چل کر نورے کے قریب آ کھڑا ہوا۔ ”کیا ارادے ہیں نور یا اب تیرے۔“ اس کے لہجے میں لا پرواہی تھی۔

نور شاید کسی گہری سوچ میں تھا۔ ایک منٹ توقف کے بعد اس نے گردن گھما کر شانے کی طرف دیکھا اور بولا ”شاید تم مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے؟“

”ہاں“ شاننا کھنکار کر مسکرایا۔ ”تمہارا پروگرام پوچھ رہا تھا۔ یاری دوستی میں ایسے موقعے بہت کم آتے ہیں۔ اور پھر تو“

”میں تیری بات سمجھ گیا۔“ نورے نے بات کاٹ دی اور شانے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکرایا۔ مجھے اپنے یاروں سے یہی امیدیں ہیں اور مجھے۔ اب بھی تمہاری ضرورت نہ ہوگی کیا؟ مگر تم۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔ وہ خود ہی رک گیا۔

شاننا تھوڑا سا سرک کر اس کے قریب ہو گیا۔ ”چن جی یاری نبھانا آسان نہیں۔ تو۔۔۔۔۔۔ تم تم۔۔۔۔۔۔ نہ کر۔ سب کچھ بتا دے مجھے۔“

نورے نے طویل سانس لی۔ گلہ صاف کیا اور پھر کچھ دیر پاؤں سے زمین کرید کر بولا۔

”ہر روز فیروزاں شام کو اکیلی کھیت پر جاتی ہے اس وقت اگر اسے کوئی بہلا کر کیکروں والے موڑ پر لے آئے تو کام بن سکتا ہے۔“ نور ایک پل رکھا تو موج خان اور جیرا بالکل پاس آ گئے۔

”میرے خیال میں تم یہ کام کر سکتے ہو۔“ نور نے بات پوری کر دی۔

شاننا ایک لمحے تک چپ رہا۔ آخر کار اسے بولنا ہی تھا کہنے لگا: ”ہے تو یہ کام بڑا مشکل! پر تو فکر نہ کرا اگر تو کہے تو اسی ڈیرے پر لے آؤں۔“

”نہیں“ نور اتر پ کر بولا ”وہ جگہ یہاں سے بہت بہتر ہے۔ ایک تو گاؤں سے آدھ میل باہر دوسرے شام کو وہاں کون گزرے گا ورنہ دو آدمیوں کا وزن اٹھا کر آسانی سے بھاگ سکتی ہے۔ اور ہاں اس ڈیرے پر بھی۔ ایک کار ہنا ضروری ہے۔“

موج خاں اس تجویز سے جانے متفق بھی تھا یا نہیں۔ مگر اسے بولنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

جیرا سنا رہی تھی خاموش بیٹھا تھا۔ بولا ”موج خاں ہوشیار آدمی ہے۔ ڈیرے کا کام سنبھال لے گا اور پھر یہاں کام ہی کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔“ سب متفق ہو گئے۔ ایک مرحلہ طے ہو گیا۔

کچھ دیر اور گزر گئی تو موج بے اور شانے نے مل کر باکی کو لوٹاڑا پھر مالش کی اور چارہ ڈال دیا۔

شام ہونے میں ابھی ایک آدھ گھنٹہ ہوگا۔ نور، شاننا اور جیرا ایک ہی پلنگ پر بیٹھے تھے ان کے چہروں پر اضطراب تھا دل دھڑک رہے تھے اور وہ گہری سوچ میں گم تھے۔

ان کے مقابلے میں موج خاں بڑا مطمئن دکھائی دیتا تھا شاید اس لیے کہ اسے ڈیرے کا کام ہی سنبھالنا تھا۔

جب آہستہ آہستہ اندھیرا نور کو جذب کر گیا اور ڈیرے کے درختوں پر لٹکے ہوئے چمگدڑ پھڑپھڑاتے ہوئے اڑنے لگے تو نور موج خاں سے گلے ملا۔ دو ایک باتیں کیں اور پھر وہ تینوں مدہم مدہم چلتے ہوئے درختوں کے اس جھنڈ سے باہر نکل آئے۔ ہوا میں ابھی تک کچھ تلخی تھی۔ کچھ دور تک وہ تینوں خاموش چلتے رہے۔ بات کرنے میں کوئی بھی پہل نہیں کر رہا تھا۔ گاؤں سے دو فرلانگ باہر آ کر وہ پروگرام کے مطابق رک گئے۔ اور آخر کار شاننا بولا ”جیرے تو یہیں رہے گا۔ اگر گولی چلنے کی آواز سنے سیدھا کیکروں والے موڑ پر چلے آنا۔“ جیرا جواب میں کھل کر مسکرایا۔

پھر شانے نے نورے کی طرف دیکھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ ”شاید پھر یہ موقع نصیب نہ ہو۔“ وہ بولا ”ابھی مل لیتے ہیں۔“ دونوں

گلے ملے۔ پھر نور اجیرے سے بھی ملا۔ پھر کچھ وعدے ہوئے۔ باتیں ہوئیں اور وقت پورا ہو جانے پر شانے نے نورے سے کہا۔
 ”لے تو اب چل سیدھا موڑ پر۔ میں فیروزاں کو موڑ پر یا موڑ کے قریب لانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کبر اس نے بانگی کی
 لگام نورے سے لے لی۔

نورے نے ایک بار پھر جیرے سے ہاتھ ملایا۔ اب اس کے مصالغے میں کچھ جوش تھا۔ شاید اس لیے کہ بچھڑنے کی گھڑی قریب
 تھی۔ بال آخر وہ جدا ہو گئے۔

نورا تیز تیز قدم اٹھاتا موڑ کی طرف چلنے لگا۔ چند قدم چلنے کے بعد نورے نے تیزی سے گھوم کر شانے کو آواز دی۔ ”عمل خاں
 والی چیز تو مجھے دے دو۔“ اس نے کہا۔ ”اس نے کہا۔“ ”موڑ پر آ کر ہی دوں گا۔ راستے میں مجھے بھی تو ضرورت ہے نا۔“ شاننا بانگی کو
 روکے بغیر بولتا چلا گیا۔

دونوں ایک دوسرے کی مخالف سمتوں کو جا رہے تھے۔ جیرا سنا درمیان میں شیشم کے ایک درخت کے نیچے کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔
 شانے نے اندھیرے میں لہراتے ہوئے سائے کو یوں پہنچان لیا جیسے وہ ان باتوں کا عادی ہو۔ اس نے بانگی کو عین سائے کے
 سامنے پہنچ کر روک لیا۔

”سرکار جی۔۔۔۔۔۔ بڑی دیر لگا دی آج۔“ شاننا بالکل رسمی لہجے میں بولا۔
 ”ہائے۔۔۔۔۔۔ میں تو کب سے کھڑی ہوں یہاں۔ ہائے یہ گھوڑی تو۔۔۔۔۔۔“ وہ رک
 ”کیا ہے اس گھوڑی کو۔“ شاننا بانگی سے نیچے اتر پڑا تھا۔
 ”یہ تو موئے نورے کی ہے۔“ فیروزاں بات پوری کر گئی۔
 ”گھوڑی پر جو سوار ہو۔ گھوڑی اسی کی ہوتی ہے میری جان۔ مگر تمہیں کیسے پتہ ہے کہ یہ۔“
 ”دشمن کی ہر چیز نظر میں ہوتی ہے نا۔“ فیروزاں نے بات کاٹ دی۔
 ”بڑی سمجھ دار ہو گئی ہو آج کل۔“ شاننا آنکھیں میچا کر بولا ”دیکھو میں اس غرض سے آیا ہوں کہ تمہیں موڑ پر جانے سے روکوں۔
 آج تو کھیت بالکل نہ جا۔ آج نور ایشکلی وہاں تیرا ہی انتظار کر رہا ہے۔“
 ”وہ کیوں؟“

”بس کیوں ویوں میں نہیں جانتا۔ تو ابھی لوٹ جا۔ ملاقات ہوتی رہے گی بعد میں۔“

”پرائیسی جلدی بھی کیا ہے؟“ فیروزاں بولی۔

”جلدی ہے نا مجھے آج بہت ضروری کام ہے ذرا نورے سے“ شانے نے بات پوری کرنے کی بجائے وہی دیدی پستول نکال کر فیروزاں کی چھاتی سے لگا دیا۔

”اوئی“ وہ چونکی اور پھر بولی ”میں نے تو سنا ہے کہ نور گاؤں سے نہیں جا رہا۔ وہ خودکشی کر لے گا مگر جائے گا نہیں۔“

”پگلی ہو تم۔۔۔۔۔ گاؤں بھر میں جو یہ بات پھیلی ہوئی ہے نا کہ نور خودکشی کر لے گا۔ وہ سب اپنا چلایا ہوا چکر ہے۔ تم کیا سمجھو گی بھلا یہ باتیں۔۔۔۔۔“ ”مجھ۔۔۔۔۔“ شانے کے لہجے میں پیارا آ گیا تھا ”تو دیکھتی جا۔ رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہٹانے جا رہا ہوں آج۔“ وہ جلدی سے بانکی پر سوار ہو گیا۔

”اچھا کل شام کو ہوں گی باتیں۔“ اس نے لگام کھینچی اور موڑ کی طرف جانے والی پگڈنڈی کی طرف چلا گیا۔ بانکی قدم قدم چل رہی تھی۔

فیروزاں حیران و ششدر دو منٹ تک وہیں کھڑی رہی پھر اس کے قدم اٹھے وہ چلنے لگی، پھر بھاگنے لگی۔ اس کا رخ کیکروں والے موڑ کی طرف تھا۔ مگر یہ راستہ جنگل سے ہو کر جاتا تھا اور مختصر بھی تھا۔

پھولے ہوئے سانس اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ فیروزاں موڑ سے کچھ دور درختوں کے جھنڈ میں ٹھہر گئی۔ اس کا جی خوف سے لرز رہا تھا۔ گلا خشک ہو رہا تھا اور ماتھے پر پسینے کی بے ترتیب بوندیں ریگ رہی تھیں۔ اس نے دیکھا۔ کیرکوں کی۔۔۔۔۔ روش میں ایک سایہ۔۔۔۔۔ دوسرے سائے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دوسرے سائے کا منہ پر لی جانب تھا۔ اسے سایوں کے پہچاننے میں کچھ بھی وقت نہ ہوئی۔

پھر اس نے یک لخت پستول چلنے کی آواز سنی اور اس آواز سے متصل ایک چیخ بھی۔۔۔۔۔ ایک سایہ گرا پڑا دوسرا بھاگ گیا۔ بانکی ہنہنائی۔۔۔۔۔ تو دور تک جنگل میں حرارت آ گئی۔

سہمی ہوئی فیروزاں نے بڑی جرات سے قدم آگے بڑھایا۔ وہ تڑپتے ہوئے ایک انسان کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے شانے کے ہاتھ میں دبکا ہوا پستول وہیں پڑا تھا۔

زخمی انسان چلایا۔۔۔۔۔ پانی پانی۔

وہ گھبرا گئی۔ اس کے قدم پانی کی تلاش میں اٹھے۔ مگر اسے ہر طرف اندھیرا دکھائی دیا۔ وہ دو قدم چلی رکی، پھر چلی، پھر واپس مڑ

آئی وہ زخمی نورے کے قدموں میں کھڑی تھی۔ اس کا سرا جسم پسینے میں تر ہو گیا۔

نورے نے ہتھیلی زمین پر رکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر اس کی کلائی کانپ کر رہ گئی۔ وہ گر پڑا سرگوشی کے انداز میں اس کے منہ سے نکلا۔ پا۔۔۔۔۔ نی“

اس کی آواز میں بے پناہ نقاہت تھی۔ فیروزاں نے نیچے بیٹھ کر اس کا سرا اپنی گود میں ڈال لیا۔ جبرؤں کو دبا کر منہ کھولا اور اپنی زبان اس کے حلق میں اتار دی۔



نئے پرانے

وہ آدمی جو تھوڑی دیر پہلے بچ کے دوسرے کونے میں آ کر بیٹھ گیا تھا، پانچواں تھا اس سے پہلے چار مختلف آدمی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس جگہ آ کر بیٹھے تھے اور رفیق کے اخبار کا کچھ مرنکال گئے تھے اور اب اخبار کے آدمے سے زیادہ صفحات اس پانچویں آدمی کے قبضے میں تھے اور وہ بچ پر کھسکتے ہوئے رفیق کے قریب آ گیا تھا۔ جب چھٹا آدمی بچ کے کونے پر آ کر بیٹھا تو رفیق نے بے ساختہ بلا جھجک اور بے تکلفی سے اخبار کا ایک حصہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”جی نہیں۔۔۔۔۔“ وہ آدمی بے تکلفی سے بولا ”مجھے اخبار نہیں چاہئے۔“

اس کے اس جملے سے چونک کر رفیق نے اس کی طرف دیکھا، تو وہ اپنی کنپٹیوں پر آئے ہوئے سفید بالوں کو کھجاتے ہوئے مسکرا رہا تھا، یہاں جان پہچان کی تو ضرورت نہیں۔ اور آپ کی یہ بے تکلفی مجھے اس وقت پسند بھی آئی۔ تاہم اخبار میں ہمیشہ اپنا پڑھتا ہوں۔۔۔“ وہ ایک پل رکا اور پھر بولا ”یوں بھی مجھے اس وقت اخبار سے زیادہ ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ سو آپ مل گئے۔ ساتھی یہاں بہت بڑی نعمت ہے“ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا تو رفیق نے اخبار تہہ کر کے بچ پر رکھ دیا۔

فیلٹ اتار کر اس نے چھڑی کو پہنا چیا اور رفیق کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا ”آپ کی تعریف“

پھر اس نے ہاتھ یوں کھینچ لیا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ مسکرا کر کہنے لگا ”میں بھی کتنے رسمی انداز سے انٹرویو ہو رہا ہوں۔ آپ صرف یہ کہئے کہ مری آپ کو پسند آیا یا نہیں۔“

رفیق کو شبہ ہوا کہ وہ آدمی اس سے مذاق کر رہا ہے۔ مگر اس کا چہرہ اس وقت سنجیدہ تھا۔ اس لمحے پانچواں اجنبی اٹھ کر چلا گیا۔ اس کی سنجیدگی کو اہمیت دیتے ہوئے رفیق ایک لمحہ خاموش رہا، پھر آہستہ سے بولا ”جی ہاں مری مجھے ہر سال کی طرح اس بار بھی پسند ہے۔ مگر صاحب تعارف کے لیے بھی کسی غیر رسمی انداز کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے نزدیک تو تعارف کا ہر انداز رسمی ہے۔“

”تو پھر پہلے آپ تعارف کرائیں۔“

”میرا نام رفیق ہے۔ بس! ابھی تک اپنے وجود کا احساس اپنے آپ کو نہیں دلا سکا اس لیے یہی کافی ہے۔“

”آپ خاصے پراسرار آدمی معلوم ہوتے ہیں“ وہ آدمی بولا۔ ”واقعی تعارف نامکمل ہو تو باتیں زیادہ بے تکلفی سے ہو پائیں گی۔“

تاہم مجھے عرفان احمد کہتے ہیں۔ سولہ برس سے پروفیسری کر رہا ہوں۔ یاد رہے پروفیسری پامسٹری نہیں۔ پڑھاتا ہوں باقی چیزیں تو بے معنی ہیں۔ البتہ اپنے وجود کا یقین ہے اور مجھے اس کا کچھ زیادہ ہی اعتراف ہے۔ شاید اس لیے کہ میں سولہ برس سے اس نسل کو پڑھا رہا ہوں۔ جی ہاں اس نسل کو! پروفیسر عرفان احمد نے سرک پڑچست اور گاڑھے گاڑھے لال نیلے پیلے رنگوں کے سویٹروں میں پھرتے ہوئے لڑکوں لڑکیوں کی طرف دیکھ کر کہا ”اگر آپ ایک دن ان کو پڑھائیں تو بخدا آپ کو اپنے وجود کا احساس ہو جائے۔“

رفیق مسکرایا، مگر پروفیسر عرفان احمد کے چہرے پر کرخت سی لکیریں ابھری آئی تھیں۔ اور وہ ہونٹ کاٹتے اور مسلسل کنپٹیوں کے سفید بالوں کو کھجاتے ہوئے سڑک پر پھرتے لڑکوں لڑکیوں کو یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے لڑکیاں لڑکے اس کے کلاس سے واک آؤٹ کر کے پھر رہے ہوں۔ ”اس نئی نسل کی تو کریم نکل کر یہاں آ جاتی ہے کم بخت“ وہ بڑبڑایا پھر ذرا بلند آواز میں بولا ”میرا بس چلے تو میں پچیس برس سے کم عمر کی لڑکی لڑکے کا داخلہ یہاں بند کروادوں۔ جس چیز کی تلاش میں میں لاہور سے بھاگ کر یہاں آیا تھا وہ یہاں بھی نہیں۔ وہی چہرے وہی لوگ سب کچھ ہے مگر وہ نہیں۔“

”وہ کیا۔۔۔۔۔۔“ رفیق نے پوچھا۔

”مسرت۔۔۔۔۔۔ ہم یہاں مسرت ہی کی تلاش میں آتے ہیں نا“ رک کر اس نے رفیق کی طرف دیکھا۔

”اس کا مطلب ہوا مسرت صرف مری میں ملتی ہے۔“ رفیق بولا ”ہاں! اگر یوں کہیں کہ ہم یہاں بھی مسرت کی تلاش میں آتے ہیں تو درست ہوگا۔“

پروفیسر جھینپ سا گیا۔ جیب سے پائپ نکال کر اس نے صاف کرنا شروع کر دیا اور بظاہر لا پرواہی سے بولا ”چلیے یوں ہی کہی۔ ہم یہاں بھی مسرت کی تلاش میں آتے ہیں۔ مگر صاحب اس سے تو لاہور ہی بہتر تھا۔ قدم قدم پر یہ چھو کرے کیا گل کھلا رہے ہیں“ پروفیسر نے مال پہ پھرتے ہنستے کھیلنے نو جوان لڑکے لڑکیوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر پھر اشارہ کیا اور ایک آہ بھری۔

رفیق اس طرف دیکھتے ہوئے مدبرانہ انداز میں بڑبڑایا۔ پھر پروفیسر کی طرف منہ پھیر کر بولا ”واللہ کیا زندگی ہے ان میں۔ یہ نسل کم از کم جینا تو جانتی ہے اور یوں پروفیسر صاحب جینے کو تو ہم بھی جی رہے ہیں۔“ وہ کچھ دیر چپ رہ کر پروفیسر کے اترے اترے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا ”آپ کی بوریت کی اصل وجہ تنہائی ہو سکتی ہے۔ آپ یہاں تنہا ہیں نا؟“

”واقعی“ پروفیسر تیزی سے بولا ”آپ نے کیسے جانا؟“

”جناب“ رفیق نے سگریٹ سلاک کر ایک کش لیا اور کہنے لگا ”کنعان میں اس طرح لمحوں میں ایک بیج کے توسط سے گھل مل جانا“

آپ کی اور میری تنہائی کا وجوہی تو ہے۔“ اس نے سینے پر انگلی بجاتے ہوئے کہا۔ ”میں خود تنہا ہوں۔ عمر میں بھی آپ کے برابر ہی ہوں۔ مگر ایک بات ہے۔“ وہ رک کر بولا ”بور نہیں ہوں اچھا برا وقت کا نالیتا ہوں۔ آدمی میں زندگی کی امنگ ہونی چاہئے۔ جینے کی خواہش ہی اس کی زندگی میں قرینہ لاتی ہے۔ اسے ایڈ جسٹ ہونا سکھاتی ہے ہر پرانی شے کو اس کے لیے نیا اور خوبصورت بنا دیتی ہے۔ مگر ایک شرط ہے“ وہ ایک لمحے تک خاموش رہا۔ پھر لمبا سانس بھر کر بولا ”پروفیسر صاحب! سینہ سمندر کی طرح ہونا چاہئے۔“

پروفیسر نے فیلٹ کو چھڑی سے اتار کر سر پر جمالیا اور چسٹر کی جیب سے ماچس نکال کر پائپ سلگانے لگا۔

”اب دیکھئے نا“ رفیق نے بات بڑھائی ”یہ ہنستے مسکراتے لوگ کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ اجلی اجلی پوشاکیں خوشی مسکراہٹیں گہما گہمی میرا تو جی چاہتا ہے کہ سارے ملک بلکہ ساری دنیا میں لوگ اسی طرح زندگی کا اظہار کرتے ہوئے نظر آئیں یعنی بالکل ہمارے ہاں عید کے دن کی طرح۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک ہر ایک چہرے پر صبح کی اجلاہٹ ہوتی ہے۔ تن پر اچھا کپڑا اور جیب میں پیسے بھی ہوتے ہیں پھر مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ان پیسوں کو اپنی خوشی سے جہاں چاہے خرچ بھی کر سکتے ہیں سب نہ سہمی میں اکثریت کی بات کر رہا ہوں۔ سمجھے نا آپ عید کے منظر اور اس منظر میں کوئی فرق ہے؟“

”یہ بات آپ کو زیب نہیں دیتی“ پروفیسر نے پائپ کو تیلی دکھاتے ہوئے کہا۔ ”نوجوان لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں اور آپ تو۔۔۔۔۔۔“ بات ادھوری چھوڑ کر پروفیسر کچھ دیر خاموش ہو کر رفیق کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر پائپ چوستے اور سر ہلاتے ہوئے اس نے اپنی بات مختلف لہجے میں بڑھائی۔ ”واقعی یہ منظر عید کے منظر سے کم نہیں۔ کیا کچھ نہیں ہے یہاں۔ کریم آف دی نیشن ہے۔ پھر دوستوں کی باپردہ بیویاں جنہیں آپ نے جی ہاں رفیق صاحب آپ نے بھی کن کن طریقوں سے دیکھنے کی کوشش نہ کی ہو گی۔ یہاں آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ آزادی۔۔۔۔۔۔ فرحت تازگی اور کھلی ہوا کا احساس تو ہوتا ہی ان باتوں سے ہے۔ اب دیکھئے نا“ پروفیسر نے رفیق کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا ”لاہور میں آپ کسی لڑکی سے بات بھی کریں۔ میرا مطلب ہے کوئی نوجوان ایسا کرے۔ تو لوگ انگلیاں کیا ہاتھ اٹھانے لگتے ہیں۔۔۔۔۔۔ مگر یہاں۔۔۔۔۔۔ جی ہاں یہاں۔۔۔!“ پروفیسر نے بات روک کر سڑک کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا۔

”اصل میں“ رفیق کہنے لگا ”ہر شریف آدمی کے اندر بھی ایک چھوٹا سا غنڈہ ہوتا ہے۔ لاہور میں اس غنڈے کو موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ آپ کی بیوی بچے رشتہ دار یا مسائے کے سامنے باہر آ سکے۔ یہاں چونکہ بہت کم جاننے والے ہوتے ہیں لہذا انداز کا حضرت ہمیشہ باہر رہتا ہے۔ کوئی جاننے وال ملا بھی تو ممکن ہے آپ کی طرح وہ بھی ایک غنڈے کے پیچھے چل رہا ہو۔ مگر اس کے باوجود مجھے

پائپ کے بے شمار کش لینے کے بعد پروفیسر نے کہا ”ہم میں اور ان میں پھر بھی بڑا فرق ہے۔ آپ بات کو دور لے گئے ہیں۔ میں تو ان بے راہ روپوں کے بارے میں ان کی بھلائی کے لیے کچھ کہہ رہا تھا۔“ اس کی آواز میں نقاہت آگئی تھی اور وہ کچھ تھک سا گیا تھا۔ اس نے سڑک پر پھرتے ہوئے جوڑوں کی طرف پھر اشارہ کیا ”یہ دیکھئے یہ لوگ تو حد ہیں صاحب‘ کیسے بغل میں ہاتھ دیئے یہ لڑکی اس لڑکے کے ساتھ لگ کر جا رہی ہے تو یہ آخر یہ سڑک ہے۔ ڈرائنگ روم تو نہیں‘ بس یہی بات میں آپ کو بتانا چاہتا تھا کہ ہمارا آپ کا پھر بھی کسی نہ کسی ذوائے سے تہذیب سے کوئی رشتہ ہے۔ مگر ان کے نزدیک تو تہذیب“

پروفیسر نے فوراً پائپ بجھا دیا۔ ”اپ جذباتی ہو رہے ہیں دراصل“۔۔۔۔۔ پروفیسر بولا۔

”میں قطعاً جذباتی نہیں ہو رہا“ رفیق نے فوراً کہا ”مجھے صرف یہ بتائیے کہ چسٹر کوٹ پتلون آپ کا تو نہیں۔ پھر آپ میں اور ان میں فرق کیا ہے۔ رہی یہ بات کہ آپ دونوں میں مہرب کون ہے تو اس کا فیصلہ آپ کے سامنے اور بھی مشکل ہے۔“

”وہ کیوں؟“

پروفیسر اتنے زور سے ہنسا کہ ایک غریب بچی جو پھل کی ٹوکری انکے سامنے رکھے حیرت سے سوال بن کر کھڑی تھی۔ ٹوکری اٹھا کر بھاگ گئی۔

”تو شادی جیسے اہم مسئلے سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں!“ پروفیسر پھر ہنس پڑا، ”پھر یک لخت سنجیدہ ہو کر بولا، ”مجھے شادی اور بچوں

رفیق بولا ”پروفیسر صاحب اگر یہ سچ ہے تو آپ واقعی پراسرار مثالی انسان ہیں۔ خود روگھاس اور جھاڑیوں سے بہتر ہے زمین بھر ہی رہے۔“

”کیا بات کہہ دی آپ نے۔“ پروفیسر پہلی بار اتنا چپک کر بولا۔ ”مگر میں نے تو کوئی بخر زمین میں بھی نہیں لے رکھی۔ وہ کچھ دیر تک مسکراتا رہا اور چھڑی کو زور زور سے زمین پر بجاتے ہوئے کھ سوچتا بھی رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے کی ساری رونق سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آگئی۔ اور پھر آنکھیں بھی پڑمردہ سی ہو گئیں اور چہرہ اس قدر سنجیدہ ہو گیا کہ اسے کرخت اور ڈراؤنا کہا جاسکتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ٹھکن اس کے جسم میں سرایت کر رہی ہے۔ اس نے لمبا سانس لے کر کہا ”بس میں نے تو سانس کی ڈوری میں دنیا جہاں کے دکھ پر دیے ہیں شاید اس لیے کہ میں اس دھرتی پر پھرنے والے ہر شخص کے چہرے کو آسانی سے پڑھ لیتا ہوں۔ اس کی آواز میں برابر نقاہت اتر رہی تھی۔ اس نے اپنی بکھری بکھری اور پریشان قوت کو مجتمع کر کے کہا ”میں اپنی ساری ذمہ داریوں سے اس لیے بھاگ رہا ہوں کہ ذمہ داریاں نبھاسکوں۔ کیا دوسروں کے مسائل کے بارے میں سوچنا ہماری ذمہ داری نہیں؟ ان کے دکھ میں دکھی اور ان کے درد کا درماں ہونا بھی تو ہمارے ذمے ہے۔“ پروفیسر نے ایک لمبی آہ بھری اور گہری سنجیدگی اور رندھی ہوئی آواز میں بولا ”میں اکثر سوچتا ہوں کہ آخر اس ساری دنیا کے انسان دکھی کیوں ہیں۔ ساری دنیا کے لوگوں کو مسرت کہاں ملے گی۔ بیشک میں بغیر کسی موضوع کے بات کر رہا ہوں مگر مجھے اس بات سے بھی چڑ ہے کہ ہم حقائق سے بھی آنکھیں چرائیں اور صرف موضوعات کو سامنے رکھ کر گفتگو کا آغاز کریں اور بحث کے دروازے کھولیں اور اپنی اپنی گھڑیاں دیکھ کر ان دروازوں کو بند کریں۔“ پروفیسر ایک منٹ تک آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا پھر بولا ”ہر محلے میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں کیا آپ نے اپنے محلے کی اس لڑکی کے بارے میں سوچا ہے جسے اس کی ماں نے بیوگی میں برتن مانجھ مانجھ کر پڑھایا تھا۔ مگر اپنے وقار کو مجروح نہ ہونے دیا تھا۔ لڑکی پڑھ لکھ کر صرف نرس بن سکی۔ مگر پانچ ہزار روپہہ ماہوار کمانے لگی کیسے؟ اس کی ماں بھی اب اس معاملے کے متعلق نہ سوچتی ہوگی کہ روپے میں بڑی طاقت ہے۔ مگر میں سوچتا ہوں۔ بخدا میں اکثر سوچتا ہوں۔ پھر وہ لڑکی جس کے باپ کا کاروبار نو دولتوں نے تباہ کر دیا ہے، جینز کا انتظار کرتے کرتے۔۔۔۔۔ پہلے چلی۔۔۔۔۔ پھر الاؤ بنی۔۔۔۔۔ سارا محلہ اس الاؤ کے گرد بیٹھا آگ تاپ رہا ہے۔ ہوا چلے گی تو راکھ سروں میں آ پڑے گی اور چنگاریاں اوپر کی منزلوں تک آپنچیں گی۔ ممکن ہے راکھ آپ کے سر تک نہ آ سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ راکھ سے تلک لگالیں۔ کیا میں ان مسائل کو اپنے سے الگ کر سکتا ہوں۔ یہ میرے مسائل ہیں۔ ہم سب کے مسائل ہیں کیا نہیں ہیں؟“

”میرے خیال میں تو یہ مسائل نہیں ہیں۔“ رفیق بولا اور اگر تھوڑی دیر کے لیے میں انہیں مسائل مان بھی لوں۔ تو ان میں نیا مسئلہ کون سا ہے؟ ازل سے یہ مسائل اس دنیا سے وابستہ ہیں۔ البتہ باپ اور بیٹے کے درمیان پھیلنے والا کرب ایک نیا مسئلہ ضرور ہے۔“

”کس نے پیدا کیا ہے یہ مسئلہ“ پروفیسر فوراً بولا اور بڑے فلسفیانہ انداز میں دو گھورتے ہوئے کہنے لگا۔ ”بیٹے میں زندہ رہنے کی امنگ ہے تو باپ میں مرنے کی۔ باپ میں زندگی کی لہر ہے تو بیٹا خودکشی پر تلا ہوا ہے۔ آخر کیوں؟ کون سا ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔ جس نے اتنے گہرے خونی اور اٹوٹ رشتے کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ یہ کیسی دیوار ہے جو خون کو خون سے الگ کر رہی ہے۔ آپ بتائیں نا۔“

رفیق نے کہا ”سوال تو میرا ہے۔“

”میرا تو خیال ہے کہ یہ سب کچھ اس نئی بے راہ روئسل کی بے معنی باغیانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔“ پروفیسر ہر لفظ کو چار ہاتھا۔ ”کیسا عجیب پردہ ہے ان کی عقل پر۔ یہ کسی کو پہچانتے ہی نہیں۔“

”پہچاننے کے لیے ہمیں بھی تو نظر کی ضرورت ہے نا۔۔۔۔۔۔“ رفیق کہنے لگا۔ ”اب آپ اپنے ہاتھ میں اپنی مرضی کے مطابق پیانہ لے کر ہر ایک کی پیمائش شروع کر دیں تو ضروری نہیں سب کی پیمائش اسی ایک گھڑے گھڑائے پیانے سے ہو جائے ہو سکتا ہے جن باتوں سے آپ مسرت حاصل کرتے ہیں وہ نئی نسل تو کیا میرے لیے بھی مسرت کا باعث نہ ہوں۔ کم از کم مجھے یہ علم ضرور ہے کہ جس نسل کو آپ بات بات پر گمراہ کہتے ہیں وہ خوشیوں کے انتظار میں غموں کا بوجھ اٹھائے پھر رہی ہے۔ آپ نے ان کی خوشی کے لیے اپنا کون سا لمحہ وقف کیا ہے ہر آدمی اپنی خوشی کے پیچھے بھاگ رہا ہے کسی کو مڑ کر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں۔۔۔۔۔۔ جیسے مڑ کر دیکھنے سے انہیں پتھر ہو جانے کا خطرہ ہو۔“

کوئی مڑ کر نہیں دیکھتا۔ نہ اپنے برابر سے گزرنے والے کے چہرے کو پڑھتا ہے آپ بھی نہیں۔ صرف سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ یوں آپ ساری دنیا کے انسانوں کے بارے میں سوچنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ مگر میرے سامنے تو آپ نے کنعان میں بیٹھ کر ان پر اعتراض کیا ہے تنقید کی ہے گالیاں دی ہیں۔ ان کے بارے میں سوچا نہیں۔ نہ ان کے دکھوں تک آپ کی نظر پہنچ پائی ہے۔ آپ کم از کم انہیں جینے کا حق تو دیں۔ سارے نظریات سارے فلسفے اس ایک نکتے کے گرد گھومتے ہیں کہ دوسروں کو آزادی کا حق ملے۔ وہ مسرت سے ہمکنار ہوں۔ اپنے ذاتی اصولوں کی عینک سے تو آپ کو ایک بھی شخص مکمل نظر نہیں آ سکتا۔ یوں گفتگو کے لیے یہ

باتیں دلچسپ ہیں۔“

”آپ بات نہیں سمجھے۔“ پروفیسر گلے سے کسی غیر مرئی شے کو نگل کر بولا، ”میرا مطلب تو ان لوگوں سے تھا جو اپنے آپ کو پیچھانتے تھے ہمیں جنہوں نے ہمارے بارے میں سوچا، ہم سے محبت کی ہمارے لیے امن قائم رکھا۔“

”ان لوگوں سے آپ کی مراد شاید پرانے لوگ ہیں۔“

”یہی کہہ لیجیے۔“ پروفیسر بولا۔

اور پرانے لوگوں نے ہمارے لیے امن قائم رکھا، رفیق اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”بے شک!“

”جانے امن سے آپ کی مراد کیا ہے۔ اگر یہی ہے کہ ناگاساکی اور ہیروشیما کے بعد لندن، پیرس، ماسکو اور واشنگٹن پر کیو اینٹیم بم نہیں گرائے گئے تو یہ بڑی بے معنی بات ہے۔ اس طرح نہ کر کے نئی نسل پر کون سا احسان ہو گیا جو آپ برہم ہیں۔ جنگ کو ٹال کر تو یہ صرف انہوں نے اپنی زندگی میں رنگ بھرا ہے۔ محض اس لیے کہ وہ اور جیمیں اور ایک ایک لمحے سے رس نچوڑیں۔

”آپ اس طرح کیوں سوچتے ہیں رفیق صاحب“ پروفیسر کہنے لگا۔ ”میں تو امن کی بات کر رہا تھا۔ اور امن سے میری مراد باپ بیٹے کے درمیان پھیلے ہوئے کرب سے پہلے کی فضا“

”میں بھی تو یہی بات کر رہا ہوں“ رفیق بات کاٹ کر بولا، ”جس طبقے کا آپ قصیدہ کہہ رہے ہیں وہی باپ بیٹے کے درمیان کرب کا نشان ہے آپ نہیں سمجھتے تو میں کہوں گا۔ بوڑھے۔۔۔۔۔۔ بوڑھے۔۔۔۔۔۔ بوڑھے۔“

”جواب میں میں بھی کہہ سکتا ہوں۔۔۔۔۔۔ جوان، جوان“ پروفیسر چھڑی گھماتے ہوئے بولا، ”مگر ممکن ہے اس میں قصور کیسی تیز اور تند شراب جیسی تلخ تہذیب کا ہو۔۔۔۔۔۔ جوان دونوں کے درمیان دیوار بن رہی ہے۔ مگر میں پھر کہوں گا کہ زیادہ قصور اس تہذیب کو اپنانے والوں کا ہے۔“ پروفیسر یوں چپ ہو گیا جیسے تھک گیا ہو۔ وہ دونوں تھکے تھکے چپ بیٹھے رہے۔ بس اسی لمحے کنعان سے لے کر مال روڈ کے ہر کونے تک کی روشنی چلی گئی۔ رنگ اور نور میں تیرنے والا مری اندھیرے میں ڈوب گیا۔ دونوں نے کچھ بولے بغیر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گیٹ تک آ پہنچے۔

جہوم کے کسی حصے سے کبھی کبھی چیخ کی آواز بھی سنائی دے جاتی مگر سگریٹ کے بے شمار ننھے ننھے سرخ جگنوؤں کے سوا کچھ نظر نہ

آتا تھا۔

رفیق نے دائیں طرف دیکھا۔ گہرا اندھیرا تھا اس نے بائیں طرف نگاہ کی۔ پروفیسر اسے کہیں نظر نہ آیا۔

کنعان کے گیٹ کے سامنے ہجوم اس قدر بڑھ گیا تھا کہ خوشبو اور اندھیرے کے ملے جلے واضح احساس میں بھی ایک رنگ جو رفیق کے دل میں رچ بس رہا تھا۔ پھر شور بڑھنے لگا۔ پھر اور۔۔۔۔۔ پھر اور پھر ایک طرف سے کسی کے چھڑی سے پٹنے کی آواز سنائی دی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب بجلی آگئی۔۔۔۔۔ نور رنگ خوشبو اور اطمینان کی ایک تہہ ساری مال پر۔۔۔۔۔ اور کچھ چہروں پر آجھی۔

تیز روشنی میں رفیق نے سب نے دیکھا۔۔۔۔۔ لوگ آس پاس کی عورتوں، لڑکیوں، حتیٰ کہ لڑکوں پر پل پڑے تھے۔ قمیضیں کھینچی جا رہی تھیں۔ درست کی جا رہی تھیں جس کے جی میں جو آیا وہ ہوا، وہ ہوتے ہوتے رہ گیا کہ روشنی پلٹ آئی تھی۔۔۔۔۔ کوئی روشنی سے آنکھ ملا سکا نہ ایک دوسرے سے کچھ بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے تھے کچھ ایسے تھے جن کے دروازے پر جوانی دستک دینے آ رہی تھی کچھ وہ بھی تھے۔ نہیں رفیق نے نوجوان خیال کیا۔

ایک آدمی ابھی تک چھڑی سے پٹ رہا تھا۔ کسی اینگلو پاکستانی لڑکی کے خالص پاکستانی دوست کے ہاتھ میں چھڑی اوپر نیچے تیزی سے گھوم رہی تھی۔

رفیق کے قریب سے بھاگتے ہوئے جب وہ دونوں آگے پیچھے نکلے تو آگے آگے پروفیسر تھا اس کا فیلڈ زمین پر گر چکا تھا اور وہ تیزی سے نیچے جانے والی گلی میں اتر رہا تھا۔

اینگلو پاکستانی لڑکی ابھی تک اپنا سکرٹ درست نہ کر سکی تھی۔ اس کے چہرے پر خراشیں تھیں اور بال نیچے ہوئے تھے لپ ٹک ٹھوڑی تک پھیل آئی تھی اور وہ ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

کنعان کے گیٹ کے بالکل سامنے رک کر ایک دہلی تیلی لڑکی نے اپنی قمیض درست کرتے ہوئے ادھیر عمر کے ایک آدمی سے کہا ”آپ کیسے باکمال ہیں انکل۔۔۔۔۔ لوگوں نے اتنا فائدہ اٹھایا۔۔۔۔۔ مگر آپ مجھے ہی کھینچتے رہے“ ”سوری۔۔۔۔۔“ آدمی بولا۔۔۔۔۔ ”میں غلط سمجھا تھا اور اب تم غلطی پر ہو۔۔۔۔۔ انکل صرف لاہور کے لیے۔“

دونوں مسکرائے پھر انہوں نے رفیق کی طرف دیکھا پھر ہتھ لگایا۔۔۔۔۔ اور آگے بڑھ گئے۔



پامسٹ

”اگر آپ پہاڑی کے اوپر سے سڑک پر بھاگتی ہوئی بس کو دیکھیں تو وہ بالکل مانگ میں دوڑتی ہوئی چیونٹی کھائی دے گی۔ یعنی بالکل کھولنے کی طرح! یقیناً اس وقت آپ اسے حسین کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جب آپ اس بس کے اندر بیٹھے ہوں۔ اور بس خواہ کتنے ہی خوبصورت پہاڑ پر کیوں نہ چڑھ رہی ہو معاملہ اس کے برعکس ہوگا اور پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر جو بس آپ نے دیکھی تھی وہ غائب ہوگی۔ صرف ڈیزل آئل کی بوجھل بوجھل بو ہوگی۔ اٹنے سیدھے مسافر ہوں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مسافر کی حالت ناقابل بیان ہو یعنی وہ۔۔۔۔۔۔“ وہ آدمی اپنی بات کو ادھورا چھوڑ کر پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔

کیسا عجیب آدمی ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ آدھ گھنٹے سے میں اس کی باتیں سن رہا تھا۔ مگر کیا مجال جو اس کی زبان ایک لمحے کے لیے بھی رکی ہو۔ بات صرف اتنی تھی کہ بس سٹاپ پر کھڑے کھڑے ہم دونوں نے بور ہو کر بڑبڑاہٹ کے سے انداز میں ایک دوسرے سے باتیں کی تھیں۔ مگر وہ تو بے تکی باتیں تھیں۔ مثلاً میں نے کہا تھا ”پورا ایک گھنٹہ ہو گیا ہے۔“ اس شخص نے جواب میں مسکرا کر گھڑی دیکھی تھی۔ اور پھر بولا تھا ”اس کا نام تو مے نو پلی بس ہونا چاہیے یہ کوئی سروں ہے۔“

پھر جب بس آگئی تو اس نے مجھے بس پر چڑھنے میں مدد بھی دی اور پھر بٹھایا بھی اپنے ساتھ ہی تھا۔ یہاں تک کہ اس نے میرا کٹ بھی خود خرید لیا تھا اور شائد ان سب احسانات کا بوجھ اتارنے کے لیے میں خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

پائپ میں تمباکو بھرنے کے بعد اس نے ماچس جلا یا اور دو تین لمبے لمبے کش لے کر کہا ”غالباً آپ سگریٹ نہیں پیتے۔“ اور میرا جواب سنے بغیر بو پھر بولا ”خیر کوئی بات نہیں۔ بات بس کی ہو رہی تھی نا۔ تو اچھا بھائی اصل قصہ یہ ہے کہ پہاڑ کی بس پھر پہاڑ کی بس ہے۔ یہ شہروں میں گھومنے والی بسیں تو مصیبت ہیں بلکہ مصیبتیں۔۔۔۔۔۔ آپ میرا مطلب تو جان گئے ہوں گے۔ جس پینے گرمی رش دھکے یہ سب ان شہروں کی بسوں کی خصوصیات ہیں۔ معلوم نہیں ایئر کنڈیشنڈ بسیں یہاں کب چلیں گی۔ یا شاید کبھی نہ چلیں گی۔ مگر مجھے کچھ یقین ہے کہ ایسا ہوگا ضرور۔“ وہ خاموش ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ باہر تیز چمکیلی دھوپ تھی۔ برسات کی گرم گرم سنہری دھوپ!

وہ تڑپ کر میری طرف پلٹا اور پھر مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ میں دے کر کہنے لگا۔ ”دس از پروفیسر جمال!“

میں اپنا نام بتانے کی بجائے بوکھلا کر ٹکڑا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ اس سٹاپ پر کھڑے ہو کر جب ہم دونوں بڑبڑاتے تھے۔۔۔۔۔ گھنڈہ بھر پہلے کی بات تھی۔ برانڈز تھروڈ پر اب ہم مزنگ چوگی آپہنچے تھے۔ پروفیسر جمال نے ابھی تک اپنا تعارف نہ کرایا تھا۔ صرف باتیں کی تھیں۔ مگر جانے کیسے یکا یک اس نے تعارف کی ضرورت کو محسوس کر لیا اور پھر میرے ہاتھ کو گرم جوشی سے دباتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں دیکھا جیسے پروفیسر جمال کے نام سے چونک کر میں اس سے لپٹ جاؤں گا۔ جب میں نے اس تعارف کا جواب صرف مسکراہٹ سے دیا تو اس نے میرے کندھے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا ”اپنا نام نہیں بتائیں گے آپ؟“

”مسعود“ میں نے اپنا نام بتایا۔

”ماسود۔۔۔۔۔ ونڈرفل۔۔۔۔۔ لولی۔۔۔۔۔ سویٹ۔۔۔۔۔“ وہ ایک دم امریکن لہجے میں بولنے لگا۔ پھر اس نے سیٹ پر جھک کر پائپ کو جھاڑا اور صاف کر کے جیب میں رکھتے ہوئے کہنے لگا ”رہائش کدھر ہے؟“

”مسلم ٹاؤن!“ میں نے کہا۔

”گڈ۔۔۔۔۔ گڈ۔۔۔۔۔“ وہ پھر اسی لہجے میں بولا ”میں عنقریب پورا پتہ پوچھ بغیر اعتماد سے کہا“ لیکن آپ بھی تو آئیے کھہ!“

”کیوں نہیں۔۔۔۔۔“ مسلم ٹاؤن کا سٹاپ آ جانے کی وجہ سے اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور میرے ساتھ ہی بس سے نیچے اتر پڑا۔ جب بس چلی گئی تو اس نے پائپ میں تمباکو بھرنے کی بجائے قریبی کھوکھے سے سگریٹوں کا ایک پیکٹ لے لیا اور اصرار کر کے مجھے سگریٹ دی اور خود سلگانے کے بعد بولا ”مجھے یہاں دس منٹ کا کام ہے۔ اس لیے اتر پڑا ہوں۔“

”کیا کام ہے آپ کو؟“ سوال پوچھنے سے پہلے میرے ذہن میں کچھ نہ تھا۔

وہ کام کی نوعیت تفصیل سے سمجھانے لگا۔ ”یہاں میرے دو ایک احباب رہتے ہیں۔ احباب تو نہیں شاگرد کہیں شاگرد۔ مجھ سے پوسٹری پڑھا کرتے تھے۔ اب تو خیر بڑے آدمی بن چکے ہیں۔ پروفیسر بن جانے سے استاد کی شاگردی تو نہیں ٹوٹ جاتی اور پھر میں ان سے ملنے کے لیے تو جانا نہیں رہا۔ کم بخت پرسوں میرے ہاں سے دو تین کتابیں اٹھالائے تھے پڑھنے کے لیے۔ بس انہیں ہی واپس لانے جا رہا ہوں۔ میں تو کتاب کا کیڑا ہوں مسٹر ماسود۔۔۔۔۔ اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کو بار بار پڑھتا ہوں۔ یوں سمجھو رات کو سونے سے پہلے سو پچاس صفحے پڑھ نہ لوں تو نیند کس عالم کو آئے گی اور پھر میاں انسان کو زندگی گزارنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا

مثال کے طور پر اگر نیلا ہے تو۔“

”جی ہاں نیلا ہے۔۔۔۔۔“ میں نے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔

”نیلا ہے تو اس پر سینریوں کے فریم زرد رنگ کے ہونے چاہئیں یعنی تقریباً مختلف کمر ہوں۔ لیکن نیلا رنگ گہرا نیلا ہو تو زرد ابھر سکتا ہے۔“

میں نے کھڑے کھڑے تنگ آ کر دروازہ کھولا اور ہم اس کمرے میں آ بیٹھے جسے کم از کم میں ڈرائنگ روم سمجھتا تھا۔ مگر مجھے اس بات کی خفت محسوس ہو رہی تھی کہ کمرے کی دیواروں کا رنگ نیلا نہیں سفید تھا۔ سفید جھوٹ تھا۔ میں کچھ دیر خاموش شرم سار سا بیٹھا رہا اور پروفیسر جمال نے سینریوں اور رنگوں پر بحث کرنے کی بجائے میز پر رکھا ہوا ایک رسالہ اٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد چونک کر اس نے رسالہ رکھ دیا اور کہا ”معاف کیجئے میں بھول گیا مسٹر ماسود آپ کا ڈرائنگ روم بہت خوبصورت ہے۔ یہ پتھر کا بنا ہوا تاج محل تو مجھے بے حد پیارا لگ رہا ہے۔ اور اس چھوٹے قالین کے رنگ کتنے شوخ ہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ آپ نے کم سے کم تیس ہزار میں لیا ہوگا۔ ایرانی ہے۔ میں تو پہلی نظر میں پہچان گیا تھا۔ کم بخت بڑا شوق ہے یہ بھی۔ مجھے بھی کبھی تھا اور اس شوق کی وجہ سے میں ایران تک بھی گیا۔ واپسی پر ہر طرح کے چھوٹے بڑے قالین خرید لیے۔ اور گھر پہنچا ہوں تو دوستوں کی فرمائشیں شروع ہو گئیں۔ ایک ایک کر کے سب بانٹ چکا ہوں صرف ایک چھوٹا سا غالیچہ اپنے پاس رکھا ہوا ہے انتظار میں ہوں اب کس دوست کی آنکھ اس پر پڑتی ہے۔ دیکھو نا ماسود صاحب۔ دوستوں کی بات مجھ سے ٹھکرائی نہیں جاتی۔ آپ بھی یقیناً ایسا ہی کرتے ہوں گے۔ ہاں تو بس آپ خود سمجھ لیں۔ آپ کی طرح دوست میری بھی کمزوری بن چکے ہیں اور دوستوں سے بڑھ کر ان کے بچے۔ بچوں سے تو مجھے بے حد پیار ہے۔ آپ کے کتنے بچے ہیں؟“

”جی۔۔۔۔۔“ میں بوکھلا کر بولا۔۔۔۔۔ ”میں تو کنوارا ہوں ابھی۔۔۔۔۔“

”اوہ گڈنس“ وہ منہ پھاڑ کر ہنسا۔ میں نے ہم کر اس کی طرف دیکھا۔ جانے وہ اتنے زور سے کیوں ہنس پڑا تھا۔ ہنستے ہنستے اس نے رسالے کی ایک بار پھر ورق گردانی کی اور ایک صفحے پر رک کر کچھ دیکھنے لگا۔ پھر بڑبڑایا ”مسکرایا اور بولا۔۔۔۔۔“ ”میں چائے ہوں۔۔۔۔۔“ لیٹن کے معنی عمدہ چائے۔ ابو صاحب۔ اب اس اشتہار پر دو سو روپے سے کم خرچ نہ آیا ہوگا۔ اور چائے ہے کہ دستیاب ہی نہیں ہو رہی کیا فائدہ اس اشتہار کا! ہوٹلوں میں جو چائے ملتی ہے سخت خراب۔ بالکل کیکر کی چھال۔ اب مجھ جیسا آدمی جو دن میں اٹھارہ مرتبہ چائے پیتا ہو اس کا گزارہ تو ہوٹلوں کی چالیس پالیاں پی کر بھی نہیں ہو سکتا اب میں تو گھر میں خود بناتا ہوں چائے۔

خوب ابال کر پتی پکاتا ہوں۔ پھر صاف ستھری چینی بقدر ضرورت اور چھان کر گرم گرم دودھ۔ یہ سب چیزیں ہوتوں میں کہاں! کیوں جی!“

”واقعی۔۔۔۔۔ جمال صاحب۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ تو گھر کے علاوہ نہیں مل سکتا۔“

پروفیسر جمال اتنی ڈھیر ساری باتیں کر کے بالکل چپ ہو گیا مجھے اب اس کی باتیں دلچسپ معلوم ہو رہی تھیں۔ جب وہ تین منٹ تک کچھ نہ بولا تو میں نے اہستہ سے کہا۔ ”چائے بنواؤں آپ کے لیے؟“

”لو۔۔۔۔۔ آپ تو تکلف کی کیا بات ہے!“ وہ فوراً بولا۔

”اس میں تکلف کی کیا بات ہے!“ میں نے کہا۔

وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔۔۔۔۔ ”بھئی۔۔۔۔۔ ایک بات ضرور ہے میں آپ کا قائل ہو گیا ہوں۔ یعنی ہم آدھ گھنٹے سے یہاں بیٹھے ہیں آپ نے چائے کے لیے نہیں کہا اور جھگڑی نے پورے پانچ بجائے ہیں تو آپ نے فوراً چائے کے لیے کہا۔ واہ۔۔۔۔۔ اسے کہتے ہیں وقت کی پابندی۔۔۔۔۔ انگریز سالے یوں ہی تو ترقی نہیں کر گئے۔ وقت کی پابندی ہی انہیں کہاں سے کہاں لے گئی۔ وقت پر کھانا۔۔۔۔۔ وقت پر اٹھنا بیٹھنا اور وقت پر چائے۔۔۔۔۔ میں بھی ہر روز پورے پانچ بجے چائے بناتا ہوں۔“

اس کے خاموش ہونے پر میں نے نوکر کو آواز دے کر چائے کے لیے کہا۔

پروفیسر جمال کی باتیں شروع میں تو مجھے عجیب سی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ میں ان سے ان کی باتوں سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے دیر بعد پوچھا ”آپ کسی کالج میں پروفیسر ہیں۔“

وہ فوراً پہلو بدل کر بیٹھ گیا اور بولا ”کسی کالج میں نہیں آج کل صرف سٹڈی کر رہا ہوں۔“ پھر اس نے جلدی سے موضوع بدل کر کہا ”آپ کو پامسٹری سے دلچسپی ہے کچھ؟“

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ کیوں نہیں!“ مجھے واقعی پامسٹری سے دلچسپی تھی۔

”ذرا پیشانی اوپر کریں۔“ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا ”اور اوپر۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔۔“

واہ۔۔۔۔۔ اب ذرا پیشانی پر تیوریاں لائیں۔ زور سے۔۔ ہوں۔ بس پیشانی ڈھیلی کر دیں۔ اب ذرا ہاتھ بھی لائیے۔ دایاں۔۔۔۔۔ دایاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔“ وہ رک رک کر بولتا جا رہا تھا اور میں خاموشی سے سب کچھ کر رہا تھا۔

پروفیسر جمال میری ہتھیلی کے مختلف حصوں کی چٹکیاں بھرتا رہا۔ پھر اس نے باری باری ہر انگلی کے ناخن کو بغور دیکھا اور منہ ہی منہ میں منمنایا۔ ”گڈ..... گڈ..... یو آر آے لکی مین۔“ اس نے ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا ”میاں شادی کے معاملے میں تم بڑے لکی ہو یعنی دلہن کے ساتھ بہت سی دولت ملنے کی توقع ہے۔ یہ دولت ’علم‘ پیسہ اور حسن کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔ مگر پیسہ اور مال و زر زیادہ متوقع ہیں“ کچھ دیر رک کر اس نے کہا ”نسبت طے ہو گئی آپ کی؟“

”جی نہیں“ میں نے کہا ”ابھی تو صرف بات چیت ہو رہی ہے۔“

اچھا کہہ کر اس نے ایک بار پھر میرا ہاتھ دیکھا پھر دونوں ہاتھوں کو ایک ساتھ دیکھنے کے بعد پروفیسر نے کہا ”میں اگر غلطی نہیں کرتا تو اس نسبت سے پیشتر بھی ایک نسبت کا سامان ہو چکا ہے۔ یعنی نسبت ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔“ میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا اور میری نگاہوں میں اس کا احترام جھلکنے لگا۔ یہ بات بالکل صحیح تھی۔

”اب یہ نسبت۔۔۔۔۔ اس نہ ہونے نسبت سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ بلکہ اسی ماہ ماہ کے اندر اندر اگر آپ نے نسبت ٹھہرائی تو میں اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ وہ مالی اعتبار سے آپ کے لیے سودمند ہوگی۔“ پروفیسر نے جیب ٹٹول کر سگریٹ کے بجائے پائپ نکالا اور تمباکو بھر کر پینے لگا۔

میں اس وقت سنجیدگی سے اپنی شادی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

نوکر نے چائے لا کر رکھی تو پروفیسر نے چائے دانی میں تھوڑی سی شکر ڈال کر ہلاتے ہوئے کہا ”دیکھئے آپ کو مجھے یہ حق نہیں دینا چاہئے کہ میں آپ سے اس قدر بے تکلف ہو کر مٹھائی کا مطالبہ کروں۔ مگر بخدا مجھے اس بات کا وپراپورا یقین ہے کہ شادی آپ کے لیے بے انتہا آسودگی اور امن لے کر آئے گی اور یہ دونوں چیزیں دولت کی محتاج بھی ہیں۔ بھلا بتائیے اس خوبصورت بات پر بھی مٹھائی کا مطالبہ کئے بغیر رہ جاؤں تو بات کیا ہوئی۔“ پروفیسر نے جیب سے دو روپے نکال کر نوکر کو دیتے ہوئے کہا۔ ”لومیاں۔۔۔۔۔ بھاگ کر دو روپے کے لٹو لے آؤ۔“

نوکر نے روپے لینے سے پہلے میری طرف دیکھا تو میری قہر آلود نگاہوں کی تاب نہ لا کر اپنا بڑھا ہوا ہاتھ یوں کھینچ لیا جیسے پروفیسر جمال کے ہاتھ میں روپے نہ ہوں سانپ ہوا

”کیا کر رہے ہیں پروفیسر صاحب“ میں نے چلا کر کہا۔ ”شادی میری اور مٹھائی آپ کھلائیں۔۔۔۔۔“

ہم کیری ہوم سے باہر نکل آئے۔

پروفیسر جمال نے چوک میں پہنچ کر میرے ساتھ گرجوٹی سے مصافحہ کیا اور ہجوم میں ڈوب گیا۔

دس تاریخ آئی۔ مجھے اس دن پروفیسر جمال سے ملنے کی تمنا شدت سے اس لیے بھی تھی کہ آٹھ تاریخ کو میری نسبت طے ہو چکی تھی اور میں یہ خبر اسے سنانا چاہتا تھا۔

وقت مقررہ پر وہ ریگل کے بس سٹاپ پر میرا منتظر تھا۔ میری جیب میں کافی پیسے تھے اس لیے میں نے اس سے کہا ”کیا خیال ہے اگر چائے شیزان میں پی جائے؟“

”جیسے آپ کی خوشی۔“ پروفیسر اس وقت سنجیدہ تھا۔

ہم شیزان میں آ بیٹھے۔ میں خبر سنانے کے لیے موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ چائے پیتے ہوئے اس نے یکا یک میرا ہاتھ دیکھا۔ پہلے سرسری نظر۔۔۔۔۔ پھر آنکھوں کے قریب لا کر اور کچھ دیر منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر کہا ”اچھا۔۔۔۔۔ تو ہم کو اطلاع ہی نہیں دی۔۔۔۔۔ لائن تو اپنی جگہ سے مڑ چکی ہے مسٹر۔ یہ دیکھو یہاں سے یوں مڑ گئی ہے نا۔۔۔۔۔ پہلے تو ایسی نہ تھی۔ کیا پھر شادی کر ڈالی یا۔۔۔۔۔“

”ابھی تو صرف مٹگنی ہوئی ہے“ میں نے بات کاٹ کر کہا ”مگر آپ کو اطلاع کہاں دی جاتی۔ آپ کے مکان کا تو علم نہیں مجھے۔ پر ایک بات ہے پروفیسر صاحب!“ میں نے حیران ہو کر کہا ”آپ کے نجوم کا قائل ہو گیا ہوں۔“

”لو۔۔۔۔۔“ وہ بولے۔۔۔۔۔ ”تو اس کا مطلب ہوا پہلے نہ تھے۔“

”تھا۔۔۔۔۔ مگر صاحب آج تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔۔۔۔۔“

”چھوڑو مسٹر ماسود۔۔۔۔۔ ایک زمانہ اپنا قائل ہے۔۔۔۔۔ یہ کہیں اب شادی کب ہے؟“

”اگلے ماہ کی پندرہ کو۔۔۔۔۔ اتوار آئے گا اس دن!“

”مبارک۔۔۔۔۔ ایک لاکھ مبارک۔۔۔۔۔!“ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”اے کہتے ہیں قسمت کا دھنی۔۔۔۔۔“

کافی دیر بیٹھنے کے بعد جب ہم باہر نکلے۔۔۔۔۔ شام ہو چکی تھی اور آسمان گدے بادلوں سے ڈھکا تھا۔ چلتے چلتے پروفیسر

بولے۔ ”آپ نے لسٹ فار لائف پڑھی ہے نا!“

”نہیں!“ میں نے کہا

دھرتی کے گھاؤ

بھرے بھرے بادل تو سبہ پہری ہی سے تنے کھرے تھے اور اب شام قریب تھی۔ شام۔۔۔۔۔ سرمئی شام یوں دھیرے دھیرے اتر رہی تھی جیسے سینے میں راز اترتا ہے ماحول میں آہ کی سی کیفیت رچی ہوئی تھی اور پھر ہوا جب درختوں سے سرسرا کر نکل گئی تو اداسیوں اور آہوں کی یہ کیفیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔

دریان موجی کے ڈیرے پر تو اچھے بھلے دنوں میں سناٹے اور ویرانی کا راج تھا۔ آج کی فضا نے تو اسے گنٹام مزار کی شکل دے دی تھی۔ ایسا گنٹام مزار جہاں کبھی دیا نہ جلا ہو۔ جس کے آس پاس پھولوں کی بجائے اگلے تھپے ہوں۔

گھنے شیشموں کے نیچے جھکے ہوئے چھپر میں وریان موجی نے پوری جوانی بتائی تھی۔ اسی پرالی کی قالین پر جو آج بھی یہاں بچھی تھی۔ بجھا ہوا دیا کو نے میں رکھی ہوئی اینٹ پر دھرا تھا اور وریان موجی اکثر دنوں کی طرح آج بھی حقے کی منہ میں دبائے کچھ سوچتا کچھ اگھٹتا نظر آ رہا تھا۔

دومی بھونکتا ہوا کھری پھلاں گ گیا تو وریان کے ہاتھ سے نے چھوٹ گئی وہ اٹھ کر چھپر کے دروازے تک آ گیا۔

سوار گھوڑی سے نیچے اتر چکا تھا۔

وریان نے اتنی زور سے پتلیاں سمیٹ کر سوار کی طرف دیکھا کہ اس کا سر ریشے میں آ گیا۔

”کچھ سنا چاہا۔۔۔۔۔“

”نہیں تو۔۔۔۔۔“ وریان نے آواز سے پہچان لیا تھا کہ ہاتھ میں کھونٹ اور سر پر مڑاسہ باندھ کر آنے والا ذیلدار کاجیہا

4

”غضب خدا کا“ وہ بولا ”ہمارے ہوتے ہوئے دن دھاڑے نور موچی کی لڑکی بالی کے کانوں سے بالی کھینچ کر لے گیا۔“

”مگر کون۔۔۔۔۔“ وریان نے یوں پوچھا۔ جیسے اس کا سانس پھول گیا ہو۔

”کوئی گھڑ سوار تھا۔۔۔۔۔ مگر تھا بزدل۔۔۔۔۔ دل گردے کا ہوتا تو اتر کر آرام سے بالیاں اتار لیتا۔ چور ہوتا تو ایسا کرتا

نا۔ کوئی اٹھائی گیر لگتا ہے۔ گھوڑی قریب لاکر ہالی میں انگلی ڈال کان چبر کر لے بھاگا۔۔۔۔۔ زخموں سے نڈھال بے چاری کھال

سے زیادہ دلیر بہادر اور نڈر تھا۔ وہ گھوڑی کی نگلی پیٹھ پر بیٹھ کر بیٹھ بیٹھ چلا ہوگا۔

رام لال ہمیشہ پیدل رہتا۔ وہ ہمیشہ شام سے پہلے ہی اس جگہ کا تمام حدود اربعہ بتا دیا کرتا تھا۔ جہاں ہمیں اس رات کچھ کرنا ہوتا تھا۔ اور محمد خاں جیسا جوان تو مائیں شاید۔۔۔۔۔ آئندہ کسی صدی میں جنیں۔ یوں بھی چہرے پر جلال تھا۔ نظریں ملاؤ، تو لگتا گھٹا برس کے کھل گئی ہے۔

کم گو تھا۔ اتنی دیر بعد سوال کا جواب دیا کرتا تھا کہ سوال ہمیں بھول چکا ہوتا تھا۔ مگر کم گوئی اور ذہانت کا جو چولی دامن کا ساتھ ہے نا وہ یہاں بھی تھا۔ بات کرتا تو یوں جیسے گن گن کر لفظ ادا کر رہا ہو۔ الفاظ کم، معنی زیادہ نکلتے۔ مشورے ایسے صحیح کہ عمل کیا تو کامرانی اور اختلاف کیا تو نامراد لوٹنا پڑا۔ مجھے سب اپنی اپنی جگہ برابر عزیز تھے۔“

وریان موہنی نے ایک بار پھر رک کر لمبا کش لیا اور پھر نے اس زوایے سے آگے سرکا دی جیسے یہ اس کا آخری کش ہو۔ ”اب مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ اس وقت میری صحیح عمر کیا تھی۔ اتنا یاد ہے کہ اپنی سوہنی کی لگا میں ڈھیلی چھوڑ کر کھینچتا تو دو دو گز چوڑا کھال پھلانگ چکی ہوتی تھی۔ اور تم اتنا تو جانتے ہو کہ گاؤں کا کھال پھلانگنے والی گھوڑیاں اب تو اپنے گاؤں میں بھی نہیں۔ سوہنی کو ایک بار بھروایا تھا۔ اس نے پھر گوری جنی تھی۔ جیسے مرے ہوئے بھی آٹھ برس ہو چکے ہیں۔

سوہنی اور گوری کا قصہ تو میں تمہیں پھر کبھی سناؤں گا۔ پہلے تم اس فرنگی کی بات سنو جو گاؤں گاؤں پھر کر جانے کیا لکھا کرتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ حکومت کا کوئی بڑا افسر ہے شاید اس لیے کہ اس کے پاس ایک نہایت خوبصورت سفید گھوڑی تھی جسے دیکھ کر آنکھیں چندھیا گئی تھیں میری۔ تم جانو گھوڑی کام کی ہو اور اپنی رال نہ ٹپکے بھلا۔

مگر اس گھوڑی کو اڑانے کا خیال انتقاماً میرے دل میں سما یا تھا۔ اس میں سراسر اس فرنگی کی غلطی بلکہ زیادتی تھی۔ اس نے مجھے بلا وجہ سورا کا بچہ کہا تھا۔

میں اس شام جمال پور جانے کے ارادے سے سوہنی پر سوار ہو کر ڈیرے سے نکلا ہی تھا۔ وہ فرنگی اس وقت اسی سمت ہی جا رہا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر اس نے سفید گھوڑی کو چابک لگائی۔ سوہنی سے بھلا اس کا کیا مقابلہ ایڑ لگانے کی دیر تھی کہ زن سے اسے پیچھے چھوڑ گئی۔

سوہنی کی ٹاپوں سے اڑی ہوئی دھول جب اس کی آنکھوں میں پڑی تو اس نے مجھے گالی دی۔ میں نے لگام کھینچی۔ سوہنی رکستے رکستے بھی سو کر دم دور نکل گئی۔ میں مڑا اور واپس آ کر اس کے سامنے تن گیا۔

”ٹم ام کو چیٹ کیا۔“ وہ میا یا۔

جی چاہا اس کے منہ پر تھوک دوں۔ مگر اس نے فوراً نرم لہجے میں کہا ”جاؤ بابا۔ ام کو راستہ دو۔“

میں چپ چاپ واپس مڑ گیا اور پھر ایک دن اچانک میں نے سوچا کہ اس کی گھوڑی کیوں نہ چھین لی جائے۔

سو پروگرام بنا کہ رات کے ابتدائی حصے میں یہ کام سرانجام دیا جائے۔ اپنے ڈیرے سے کچھ دور خوبصورت درختوں کے کنارے اس فرنگی کا بنگلہ تھا۔ باقی کام فی الحال رام لال کا تھا۔

رام لال شام کے فوراً بعد ہی لوٹ آیا۔ اس نے بتایا کہ گھوڑی رات کو گیراج میں رہتی ہے اور نوکر برآمدے میں سوتے ہیں نوکروں کی تعداد بھی تین سے زیادہ نہ نکلی!

میں نے نوکروں کا مذہب پوچھا تو رام لال نے بتایا کہ وہ سب کے سب ہندو ہیں۔

یہ بات کہتے کہتے رام لال خود بھی ہنس پڑا اس کا مطلب تھا کہ نوکر ہمارے مقابلے کو ہرگز نہ آئیں گے۔

یہ پہلا دن تھا۔ جب میں مان سنگھ اور محمد خاں پیدل اس فرنگی کی کوشی کی طرف گئے۔ حسب دستور مان سنگھ کو دروازے پر چھوڑ کر ہم دونوں اندر کی طرف بڑھے تو ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ایک چھوڑ یہاں تین کتے تھے اور ہم ان کے لیے کوئی شے لانا بھول گئے تھے۔ میں نے مان سنگھ کو کتوں کے لیے کچھ لانے کے لیے بھیجا اور پھر بڑے پھانک کی اوٹ میں کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ اسی دوران میں گھوڑی ہنہنائی، ہم دونوں چونکے مڑ کر دیکھا تو گھوڑ پر زین کسی جا رہی تھی۔ شاید فرنگی کہیں جا رہا تھا۔ ہمیں بڑی مایوسی ہوئی مگر محمد خاں وقع کی تلاش میں عقابانی نظروں سے گھوڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

گھوڑی کی لگام پکڑے ایک نوکر اسے باہر لایا اور پیچھے مڑ کر یوں دیکھنے لگا جیسے سوار کا منتظر ہو۔ میں اور محمد خاں ابھی تک فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ کیا کریں۔ ہم نے دیکھا کہ فرنگی ہاتھ میں ہلکی سی چھڑی لیے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ اچانک وہ یوں پلٹا جیسے کوئی شے بھول آیا ہو۔

محمد خاں نے اسی موقع کو غنیمت جان لیا۔ اوٹ سے نکلا، نوکر کے ہاتھ سے لگام چھینی اور رکاب میں پاؤں ڈال سوار ہو گیا۔ سوہنی ہوتی تو چھلانگ مار کر دیوار پھاند جاتی۔ مگر یہ فرنگی کی گھوڑی تھی۔ اس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ اس کے ایک آدھ بار اچھلنے کی آواز سن کر فرنگی پھر مڑا اور میں نے زرد لیپ کی روشنی میں سب کچھ دیکھ لیا۔ میرے سامنے محمد خاں کی موت منڈلانے لگی۔ فرنگی نے پستول نکال کر اپنے نوکر کو پرے ہٹ جانے کے لیے کہا وہ ہٹا تو گھوڑی ایک بار پوری قوت سے اچھلی کہ اس کے اگلے پاؤں آسمان کی سمت

اٹھ گئے۔ شاید اسی لمحے پستول چلی۔ گولی گھوڑی کی پیٹھ کو چھو کر جونکی تو وہ اتنی بدحواس ہو کر بھاگی کہ چاندنی رات میں دور تک دھوکے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ فرنگی بھاگ کر پھاٹ تک آیا۔ اس نے ایک دوبار پھر گولی چلائی اور ہانپ کر رہ گیا۔ ”ساؤر کا باچا“ اس نے ہوا میں گالی اچھالی اور تیزی سے اندر کی طرف بھاگا۔ یہ موقع میرے لیے بے انتہا بہتر تھا۔ میں پھانک سے نکل کر جو بھاگا تو سیدھا ڈیرے پر آ کر سانس لیا ہے۔

محمد خاں بچ گیا تھا۔ مگر گھوڑی۔۔۔۔۔ اور پھر زخمی گھوڑی کو چھپانے کا سوال ابھی باقی تھی۔

زخمی نہ ہوتی تو جمال پور بھجوا دی جاتی۔ مگر ایسا ہوتا کیسے! ایسا ہوتا تو محمد خاں زندہ کیونکر آ سکتا تھا۔ مان سنگھ ڈیرے پر ہی تھا۔ اس نے ساری بات سنی تو زرد پڑ گیا۔ ”ایک گھوڑی کے لیے خواہ مخواہ گاؤں بھر کے لیے مصیبت مول لے لی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ گو پس پردہ گھوڑی کا مسئلہ نہ تھا۔ وہ ضد تھی جو ہمیں فرنگی سے ہے۔ وہ نفرت تھی۔ جو اس انگریز کی نفرت کا جواب تھی۔ تاہم گاؤں والے تو معصوم تھے نا۔

اسی دوران میں محمد خاں گھوڑی چھوڑ کر واپس آ چکا تھا۔ اس نے ایک لمحہ خاموش رہ کر دھیمے لہجے میں کہا ”بہر صورت گھوڑی کو صبح سے پہلے گاؤں سے نکال دینا چاہئے۔“

بات تو پتے کی تھی مگر گھوڑی کی پیٹھ کا زخم کچھ کرنے نہ دیتا تھا۔ پھر بھی اسے سب کے مشورے پر بھروسے والے کمرے میں بند کر دیا ہم جھوپڑی میں آ بیٹھے اور بیٹھے بیٹھے رات گزار دی۔

صبح موذن کی اذان کے ساتھ ہی گاؤں کے چپے چپے میں پولیس پھیل گئی۔

یہاں بھی محمد خاں کی ذہانت کام آئی۔ وہ پولیس کے ساتھ مل کر ملزموں کو ڈھونڈنے لگا۔ بات گھوڑی کے قدموں پر آ گئی۔ قدموں کے نشان دیکھتے دیکھتے محمد خاں شہر جانے والی پگڈنڈی کی طرف چلا گیا۔ جانے وہ کس گھوڑی کے قدم تھے، مگر تھے ضرور یہ چال کچھ ایسی کارگر ثابت ہوئی کہ گاؤں پر پولیس کا شک نہ رہا اور وہ لوگ گھوڑی کے قدم دیکھتے ہوئے شہر کی طرف نکل گئے۔

کچھ دنوں بعد ہمیں گھوڑی کو اس لیے گولی مروادینی پڑی کہ اس کی ٹانگ کا زخم خود اس کے لیے تکلیف کا باعث بن رہا تھا۔ گھوڑی کی لاش ہم اسی بھوسے والے کمرے میں دفن کر چکے تو ہمارے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

میں ان دنوں حیران تھا کہ انگریز نے میرا نام کیوں نہ لیا!

پھر ایک دن میں نے اس کل دار کھلونے سے مشابہ فرنگی کو جمال پور جانے والی پگڈنڈی پر دیکھا۔ اب اس کے پاس سیاہ گھوڑا

”سری کال“ اس نے جلدی سے کہا۔۔۔۔۔ اور گھوڑی کی پیٹھ کو پاؤں کی ایڑیوں سے اتنے زور سے بجایا کہ وہ ایک آدھ

وریان موجی گردن جھکا کر چند لمحے خاموش رہا کہ سب کے سب اونگھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ مگر سب کے سب کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔

”کتنے دکھ کی بات ہے۔“ وریان نے لب کھولے ”گورے جو ظلم کالوں پر روا نہ رکھ سکے۔ آج کالے کالوں پر کر رہے ہیں۔ اب کان چیر کر بالی لے جانے والا بھی تو کوئی کالا ہی تھا۔ ان کو روکنا اب بوڑھی ہڈیوں کے بس میں نہیں۔ یہ کام تو تم جوانوں کا ہے۔ برا برائی نہیں چھوڑتا تو بھلا بھلائی کیوں چھوڑے۔“

باہر بادل گر جا اور سن سے سرد ہوا کا جھونکا جھونپڑی کے اندر آیا کہ پانی کے ذرات نے سب کے چہرے چوم لیے۔ فضا مرطوب سی ہو گئی تو جیمے نے جھر جھری لے کر کہا ”اچھا جو مولا کرے۔“

وہ اٹھا تو باقی تینوں جوان بھی اٹھ بیٹھے۔ اور سلام کرنے کے بعد سب کے سب باہر نکل گئے۔

کچھ دیر تو ان کے پاؤں کے نیچے آنے والے سوکھے پتوں کی چرڑ مرڑ سنائی دی۔ پھر تیز ہوا کے شور کے ساتھ بادل گر بنے لگا۔



Find More Stories in Urdu Go : www.iqbalkalmati.blogspot.com